جلد ۸۰ ستمبر ۱۹۷۳ء عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد (۸۰) | ستمبر ۱۹۷۳ء مطابق شعبان ۱۳۹۳ھ | عدد (۱)

ماہنامہ ترجمان القرآن

ذیلدار پارک۔ اچھرہ لاہور

زرِ سالانہ: دس روپیہ ——— فی پرچہ: ایک روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔ پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پاکستان گزشتہ کئی برس سے جن حالات سے گزر رہا ہے انہیں دیکھتے ہوئے یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس ملک کے باشندے خداوند تعالیٰ کی رحمت کو نہیں بلکہ اس کے غضب کو دعوت دے رہے ہیں۔ سیاسی اضطراب، معاشی بدحالی، مہنگائی، غنڈہ گردی، چور بازاری، جان و مال کا زیاں، لوگوں کی عزت و آبرو پر حملے، ظالم حکمرانوں کی چیرہ دستیاں اور جابر اور خدا کے خوف سے عاری عُمّالِ حکومت کی زیر دست آزاریاں زندگی کا معمول بن گئی ہیں۔ چنانچہ اس ملک کا ہر فرد اپنے آپ کو شدید عذاب میں گرفتار پا رہا ہے۔

قومی سطح پر بھی ہر شخص پوری شدت سے اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ اس قوم پر اللہ کی رحمت کا سایہ نہیں بلکہ نحوست کی پرچھائیں پڑ رہی ہیں اور اسی وجہ سے دنیا کی قوموں میں اس کی ساکھ گر گئی ہے۔ وہ بھارت جو ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اس سے منہ کی کھا چکا تھا ۱۹۷۱ء میں اسی سے نصف ملک چھین لے گیا ہے اور دنیا میں اِس ملک کو جس احترام کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے اُس کا اندازہ اُس پذیرائی سے کیا جا سکتا ہے جو حال ہی میں وزیر اعظم بھٹو کے غیر ملکی دورے کے دوران مختلف ممالک میں ہوئی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ان اَن گنت مصائب و شدائد کو دیکھتے ہوئے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مالک الملک ہم سے کسی قدر ناراض ضرور ہے۔

خداوند قدوس کی ناراضگی کا اظہار اُن آفاتِ ارضی و سماوی سے بھی ہوتا ہے جو ہم پر وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہتی ہیں خصوصاً حالیہ سیلاب نے اِس ملک کو جس خوفناک تباہی سے دوچار کیا ہے اُسے دیکھتے ہوئے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ خالقِ کائنات کی ناراضگی جو مختلف تنبیہات کی صورت میں گزشتہ بیس سالوں میں رونما ہوتی رہی ہے اب غضب کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے اور معاملہ تنبیہ اور سرزنش سے گزر کر عقوبت و عذاب تک آپہنچا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا خداوند تعالیٰ نے یونہی بغیر کسی وجہ کے پاکستان پر سے اپنا دستِ شفقت و رحمت ہٹا لیا ہے یا اہلِ پاکستان نے کوئی ایسی روش اختیار کی ہے جس کی وجہ سے وہ ان سے ناراض ہوا ہے۔ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ کسی قوم کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے وہ اس سے اس پر مسلط کرتا ہے:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا۔ (النساء: ۱۴۷)

آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکرگزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدر دان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا۔ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا۔ (الطلاق: ۸-۹)

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان کا سخت محاسبہ کیا اور ان کو بری طرح سزا دی۔ انہوں نے اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور ان کا انجام کار گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔

جو خدا انسان کے لیے اس کے ماں باپ سے کہیں زیادہ شفیق اور رحیم ہے اور جس کی صفتِ رحمت اُس کی دیگر تمام صفات پر حاوی ہے وہ ان کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور فروگزاشتوں کی وجہ سے تو اُن پر عذاب مسلط نہیں کر سکتا۔ وہ یہ فیصلہ اُسی وقت کرتا ہے جب کسی قوم کی عظیم اکثریت جان بوجھ کر خدا سے بغاوت اور سرکشی کی راہ اختیار کرے اور بار بار کی تنبیہات کے باوجود اس روش کو چھوڑنے پر تیار نہ ہو اور مالک الملک کی نافرمانی میں زیادہ دلیر اور جری ہوتی چلی جائے اور اپنی ہر آن بڑھتی ہوئی بداعمالیوں کی بنا پر خدا کے غضب کو بھڑکائے۔ قرآنِ مجید نے اُس راہ کو جس پر چل کر کوئی قوم عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوتی ہے اپنے بلیغانہ انداز میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ

تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے، اور ان قوموں کو مصائب و آلام

لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ ۔ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَٰكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ط حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ ۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ط

(الانعام ۴۲-۴۵)

میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں۔ پس جب ہماری طرف سے اُن پر سختی آئی تو کیوں نہ انھوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہو گئے اور شیطان نے اُن کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔ پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان پر کھول دیے یہاں تک کہ جب وہ اُن بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اُس وقت وہ خیر سے بالکل مایوس تھے اس طرح اُن لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا تھا۔

اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے بڑی جامعیت کے ساتھ ان ساری منازل کی نشاندہی کر دی ہے جو قوموں کو عذاب کی طرف لے جاتی ہیں۔ جب کوئی قوم احکامِ خداوندی کو پسِ پشت ڈالتی ہے تو اسے تنبیہ کے طور پر مختلف مصائب و آلام سے دوچار کیا جاتا ہے تاکہ وہ غلط روش سے ہٹ کر نیکی اور خدا ترسی کی راہ اختیار کرے۔ اِن مصائب کی کئی ایک صورتیں ہوتی ہیں مثلاً غلے اور پھلوں کی کمی، تند و تیز ہواؤں کا چلنا، ملک کا مختلف وباؤں کی لپیٹ میں آجانا، آبادی پر دوسری قوموں اور سلطنتوں کی ہیبت طاری ہو جانا اور عوام کے اندر اخلاقی انحطاط اور اس سے پیدا ہونے والے دوسرے عوارض ——— عذابِ الٰہی کی چھوٹی چھوٹی صورتیں ہیں جو گم کردہ راہ انسانوں کو بار بار جھنجھوڑتی ہیں کہ وہ اللہ سے بغاوت کی راہ ترک کر کے حق و صداقت کی راہ پر گامزن ہوں۔ مگر جب وہ اِن تنبیہات سے کوئی اثر نہیں لیتے بلکہ سرکشی کی راہ جسے شیطان نے غلط قسم کی دنیوی ترغیبات سے مزین کر رکھا ہوتا ہے، پر بڑی سرعت سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر تنبیہات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور اِن خدا ناشناس انسانوں کو قدرت ہر وہ چیز فراہم کرتی ہے جس سے

وہ خدا اور آخرت سے بالکل غافل ہو کر اور شیطان کے بندے بن کر زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ پھر وہ علیم و خبیر ذات جب یہ محسوس کرتی ہے کہ اُن کے اندر کا جوہرِ انسانیت بالکل ختم ہو چکا ہے جس کے زیرِ اثر ان کا راہِ راست پر آنا ممکن تھا تو ان کے وجود کو اس طرح مٹا دیتی ہے کہ اُن کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا صرف عبرت کی داستانیں باقی رہ جاتی ہیں جن سے عبرت پکڑنے والے عبرت پکڑتے ہیں۔ کسی فرد یا قوم کے لیے خدا کی طرف سے اس سے بڑی سزا اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اُسے اہلِ دنیا کے لیے سامانِ عبرت بنا دیا جائے۔

قرآنِ مجید نے جہاں عذابِ الٰہی کی مختلف منازل اور صورتوں کا ذکر کیا ہے وہاں اس نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ اُن اسباب کو بھی بیان فرمایا ہے جن کی وجہ سے کسی قوم پر اللہ تعالیٰ عذاب نازل کرتا ہے۔ ان صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان سارے اسباب کا ذکر کیا جائے جو کتاب و سنت میں بیان کیے گئے ہیں۔ ہم صرف چند نمایاں اسباب بیان کرتے ہیں۔ خدا کے غضب کو انسان کا جو عمل سب سے زیادہ بھڑکاتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کا بندہ اس کی کائنات میں ظلم کا ارتکاب کرے۔ چنانچہ سورۂ یونس میں مذکور ہے:

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۚ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ۔ (یونس: ۱۳)	تم سے پہلے کی قوموں کو (جو اپنے اپنے زمانہ میں برسرِ عروج تھیں) ہم نے ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر نہ دیا۔ اسی طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔

اہلِ لغت کے نزدیک ظلم کے معنیٰ ہیں وضع الشیئ علی غیرِ محلہ، یعنی کسی چیز کو اس کے اصلی مقام پر نہ رکھنا خواہ کمی یا زیادتی کر کے یا اسے اس کے صحیح وقت یا اصلی جگہ سے ہٹا کر۔ اسی سے ظَلَمْتُ السِّقَاءَ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ ہیں مشکیزہ میں دودھ جمنے کے لیے رکھا اور دہی بننے سے پہلے ہی پی لیا۔ ایسے دودھ کو ظلیم کہتے ہیں اسی طرح عربی میں ظلمتُ الارض کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے زمین کو ایسے مقام سے کھودا جہاں سے اسے کھودنا نہیں چاہیے تھا اس قسم کی زمین کو مظلومہ کہا جاتا ہے۔ لفظِ ظلم کے معنیٰ کی

دستوں کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ادائے حقوق میں ہر قسم کی کمی بیشی خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد یا خود انسان کے اپنے جسم و جان کے حقوق ــــــ ظلم کے دائرہ میں آتی ہے ۔ انسان کا اس سے بڑا جرم کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ وہ شعور و وقوف کی قوتوں سے بہرہ مند ہونے کے باوجود جادۂ مستقیم سے ہٹ کر ظلم کی راہ اختیار کرے ۔ یوں تو ہر گناہ اور ہر جرم پورے معاشرہ پر اثر انداز ہوتا ہے مگر ظلم ایک ایسا گناہ ہے جس سے نہ صرف پورے معاشرے کا توازن بگڑ جاتا ہے بلکہ انسان اور خالق کے مابین ، انسان اور انسان کے درمیان اور انسان اور کائنات کے درمیان فطرت نے جس قدر رشتے قائم کر رکھے ہیں وہ زیر و زبر ہونے لگتے ہیں ۔ خالق کائنات اس زبردست بگاڑ کو کب تک گوارا کر سکتا ہے ۔ چنانچہ جب کسی قوم کی بھاری اکثریت ظالمانہ روش اختیار کر لیتی ہے تو پھر اس پر عذاب مسلط کر کے یا تو دنیا سے محو کر دیا جاتا ہے یا اس کی قوت کو اس انداز سے منتشر کیا جاتا ہے کہ وہ قوم دنیا میں بالکل بے وزن ہو کر رہ جاتی ہے اور اجتماعی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے دائرے میں بھی اس کا کوئی اثر یا عمل دخل باقی نہیں رہتا اور دنیا کی زمام کار ان لوگوں کو سونپی جاتی ہے جو ظلم کی راہ چھوڑ کر اور ظلم اور نا انصافیوں کے اثرات کو مٹا کر انفرادی اور اجتماعی زندگی کو حق و صداقت کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں ۔

ظلم ہی کی ایک دوسری صورت جس سے اللہ تعالیٰ کا غضب جوش میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی آیات کو جھٹلایا جائے ۔ اسی سلسلے میں قرآنِ مجید کا ارشاد ہے :

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا	اللہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا
نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا	کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ
مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔	وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدل دیتی ۔
كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ	اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے ۔
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ	آل فرعون اور ان سے پہلے کی قوموں کے
بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ	ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ اسی ضابطہ کے مطابق
وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۔	تھا انہوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا
(الانفال : ۵۳ - ۵۴)	تب ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں

ہلاک کر ڈالا اور آلِ فرعون کو غرق کر دیا۔ یہ سب ظالم لوگ تھے۔

ائمۂ لغت نے لفظِ آیت کے اشتقاق کے بارے میں تو اختلاف کیا ہے مگر اس بارے میں سب متفق ہیں کہ اس لفظ کا اطلاق روشن اور واضح نشانی پر ہوتا ہے جسے جھٹلانے کے لیے بجز ہٹ دھرمی کے اور کوئی وجہ نہیں ہوتی قرآنِ مجید میں یہ لفظ آیاتِ قرآنی کے لیے بھی مستعمل ہوا ہے اور اُن نشانیوں کے لیے بھی جو انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی ہیں مثلاً سورہ العنکبوت میں ہے:

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ ۔ (العنکبوت: ۴۹)

بلکہ یہ روشن آیتیں ہیں جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے ان کے سینوں میں (محفوظ) اور ہماری آیتوں کا وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو ظالم ہیں۔

اسی طرح سورۂ یوسف میں آیات کا لفظ اُن روشن دلائل کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے خالقِ کائنات نے آسمان اور زمین میں قدم قدم پر پھیلا رکھی ہیں۔

وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ (یوسف: ۱۰۵)

زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں دیتے۔

جس طرح ایک فرد فضائے بسیط میں ہر طرف پھیلے ہوئے نور کا اگر انکار کر دے تو اس کے بارے میں دو ہی راہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ آنکھوں سے یکسر اندھا ہے کہ سورج کی روشنی کو دیکھ نہیں پاتا یا پھر وہ پرلے درجے کا ضدی اور ہٹ دھرم ہے کہ ایک واضح اور روشن چیز کا ڈھٹائی سے انکار کر رہا ہے۔ جب کسی قوم میں عقل کے اندھے اور نیت کے کھوٹے افراد کی کثرت ہو جائے اور یہی لوگ معاشرے میں سیاہ و سفید کے مالک بن جائیں تو اس معاشرے کا وجود دنیا اور اہلِ دنیا کے لیے موجبِ خیر و برکت نہیں رہتا بلکہ پریشانی اور مصیبت کا باعث بن جاتا ہے۔ اس کے وجود سے حق اور اس کی قوتوں کو نقصان پہنچتا ہے اور باطل اور اس کی قوتوں کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال سے اُن ساری اقدار کو شدید صدمہ پہنچتا ہے جن کے بل بوتے پر انسان بحیثیت انسان دنیا میں زندہ رہتا ہے جب اللہ تعالیٰ ان اقدار کو شدید خطرے میں گھرا ہوا پاتا ہے تو پھر جو لوگ انہیں تباہ و برباد

کرنے کے درپے ہوتے ہیں اُن کی قوت کو توڑنے کا التزام کرتا ہے کیونکہ وہ یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ انسانیت کا وجود ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ انسانیت کو بچانے کے لیے اگر اسے چند سو یا چند ہزار یا چند لاکھ انسان نما شیاطین کو ختم کرنا پڑے تو وہ کر ڈالتا ہے اور انسانیت اور اس کی بنیادی اقدار کو بہر طور بچاتا ہے۔

خدا کے غضب کو بھڑکانے والے ان دو اسباب کے علاوہ تیسرا سبب یہ ہے کہ انسان خدا کی عطا کردہ نعمتوں کے بارے میں شکر گزاری کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے ناسپاس گزاری کا مذموم طرزِ عمل اختیار کرے مثلاً اگر کسی شخص کی صحت خراب ہو اور شافی مطلق اسے شفائے کامل سے بہرہ ور کر دے تو وہ اس ذات کی اطاعت و فرمانبرداری اور اس کی بارگاہ میں سجدۂ شکر بجا لانے کے بجائے اپنی صحت کو ان کاموں میں تباہ کرنے لگے جو قادرِ مطلق کی نگاہ میں سخت ناپسندیدہ ہوں۔ اسی طرح غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اور معاشی بدحالی میں گرفتار کوئی قوم اگر خداوند تعالیٰ سے آزادی اور معاشی خوشحالی کی طالب ہو اور اس سے یہ وعدے کرے کہ غلامی کے بندھن ٹوٹنے اور معاشی بدحالی دور ہونے کی وجہ سے اسے دنیا میں جو اقتدار اور قوت و طاقت نصیب ہو گی وہ اسے حق و صداقت کا علم بلند کرنے کے لیے صرف کرے گی لیکن جب اللہ تعالیٰ اسے یہ منہ مانگی نعمتیں عطا کر دے تو پھر وہ باطل قوتوں کے ساتھ مل کر باطل کا بول بالا کرنے میں منہمک ہو جائے ایسی ناسپاس گزار، وعدہ خلاف اور باطل کی حمایت کرنے والی قوم کو اللہ تعالیٰ کس طرح مدتِ دراز تک دنیا میں سربلند رکھ سکتا ہے۔ وہ اصلاحِ احوال کے لیے مناسب مدت تک موقع ضرور دیتا ہے مگر جب اس کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تو پھر عزت و سربلندی کے مقام سے ہٹا کر ذلت و پستی کے نشیب غاروں کی طرف دھکیل دیتا ہے اور خوشحالی کے بجائے اُن پر افلاس و نکبت مسلط کر دی جاتی ہے۔ سورۂ سبا میں کفرانِ نعمت کے نتیجے میں آنے والے عذاب کا خاص طور پر ذکر موجود ہے۔

لقد كان لسبإ في مسكنهم آية جنتان
عن يمين وشمال كلوا من رزق ربكم و
اشكروا له بلدة طيبة ورب غفور
فأعرضوا فأرسلنا عليهم سيل العرم

(سبا: ۱۵-۱۶)

سبا کے لیے ان کے اپنے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی دو باغ دائیں اور بائیں۔ کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور شکر بجا لاؤ اس کا، ملک ہے عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا۔ مگر وہ منہ موڑ گئے آخر کار ہم نے ان پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے خداوند تعالیٰ کی یہ عظیم نعمت یاد دلائی جو انہیں فرعون کی غلامی سے نجات دلانے کے سلسلہ میں عطا کی گئی اور جس کے حصول کے بعد ان سے اس بات کی بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اس خوفناک عذاب سے بچ نکلنے کے بعد اللہ کے اطاعت گزار بندے بن کر زندگی بسر کریں گے۔ (باقی بر صفحہ ۴۶ پر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پیدائش سے آغاز نبوت تک

ولادت مبارکہ آخر کار وہ وقت آپہنچا جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کے ایک حصہ کو مکہ کی بے آب وگیاہ وادی میں لاکر بسایا تھا اور جس کے لیے خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت انھوں نے اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل نے دعا مانگی تھی کہ:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔ (البقرہ ۱۲۹)	اے ہمارے رب، اور تو ان لوگوں میں خود انھی کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو جو انھیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔

اس مبارک ساعت کے آنے سے تھوڑی مدت پہلے ابرہہ ۶۰ ہزار فوج لے کر اپنی تقدیر سے لڑنے آیا تھا، مگر وہ ۶۰ ہزار نہیں ۶۰ لاکھ بھی لاتا تو اس کا وہی انجام ہونا جو ہوا۔ جہاں اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا منصوبہ یہ کام کر رہا ہو کہ اس مقام پر وہ ہستی وجود میں لائی جائے جو دنیا کی تاریخ بدل ڈالنے والی تھی، جو تمام نبوتوں کی آخری اور سب سے بڑی نبوت تھی اور جس کے لیے ڈھائی ہزار برس پہلے سے تیاری کی جا رہی تھی، وہاں کوئی بڑی سے بڑی انسانی طاقت بھی اللہ کی طاقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

محدثین اور مورخین کا اس بات پر قریب قریب اتفاق ہے کہ اصحاب الفیل کا واقعہ (یعنی مکہ پر ابرہہ کا حملہ) محرم میں پیش آیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ربیع الاول میں ہوئی۔ ولادت پیر کے روز ہوئی تھی، یہ بات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی کے سوال پر بیان فرمائی ہے (صحیح مسلم بروایت ابی قتادہ)۔ ربیع الاول کی تاریخ کون سی تھی؟ اس میں اختلاف ہے۔ لیکن ابن ابی شیبہ نے حضرت عبداللہؓ بن عباس اور حضرت جابرؓ بن عبداللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ ۱۲ ربیع الاول کو پیدا ہوئے تھے۔ اسی کی تصریح محمد بن اسحاق

سنے کی ہے اور جمہور اہل علم میں یہی تاریخ مشہور ہے۔ واقعۂ فیل اور حضورؐ کی پیدائش میں فصل کتنا تھا؟ اس میں بھی اختلاف ہے۔ مگر مشہور ترین قول یہ ہے کہ آپ اس واقعہ کے ۵۰ دن بعد پیدا ہوئے۔ شمسی اور قمری مہینوں اور سالوں کے درمیان مطابقت ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اس لیے قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ پیدائش کا شمسی سال اور مہینہ کونسا تھا۔ عموماً آپ کا سنہ پیدائش ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء بیان کیا جاتا ہے۔ سُہَیلی نے روض الانف میں ۲۰ اپریل (نیسان) تاریخ بتائی ہے، مگر سال کا ذکر نہیں کیا۔ کوسان دو پرسفال (CAUSSAN DE PERCEVAL) اپنی کتاب تاریخ عرب میں ۲۰ اگست ۵۷۰ء تاریخ پیدائش متعین کرتا ہے۔ حتیٰ (HITTI) لکھتا ہے کہ آپ ۵۷۱ء یا اس کے لگ بھگ زمانے میں پیدا ہوئے۔ اور بعض مستشرقین ۲ سال پیچھے جا کر ۵۶۹ء آپ کا سال پیدائش بیان کرتے ہیں۔ ولادتِ مبارکہ کا وقت معتبر روایات میں صبح صادق بیان کیا گیا ہے۔

بشارات اور اسم گرامی معتبر روایات میں آیا ہے کہ زمانۂ حمل میں بی بی آمنہ نے خواب میں دیکھا کہ ان کے اندر سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کے محلات تک روشن ہو گئے ہیں۔ ایک اور مرتبہ خواب میں ان سے کہا گیا کہ تمہارے پیٹ میں اس امت کا سردار ہے، جب وہ پیدا ہو تو اس کا نام محمدؐ رکھنا۔ ابن سعد نے ایک روایت نقل کی ہے کہ خواب میں آپ کا نام احمد رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی[۱]۔ ممکن ہے کہ یہ دو نام دو مختلف خوابوں میں بتائے گئے ہوں کیونکہ حضورؐ کے یہ دونوں ہی نام احادیث سے ثابت ہیں۔ بکثرت روایات میں بی بی آمنہ کا یہ بیان بھی نقل ہوا ہے کہ جب آپ پیدا ہوئے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے اندر سے ایک نور نکلا ہے جس سے مشرق و مغرب روشن ہو گئے ہیں۔ بیہقی اور ابن عبد البر نے عثمان بن ابی العاص الثقفی کی ماں کا بھی یہ بیان نقل کیا ہے کہ حضورؐ کی ولادت کے وقت وہ بی بی آمنہ کے پاس موجود تھی، اس وقت جدھر نظر جاتی تھی نور ہی نور نظر آتا تھا۔

پیدائش کے ساتویں روز جناب عبد المطلب نے آپ کا عقیقہ[۲] کیا اور قریش کے لوگوں کو کھانے کی دعوت دی۔ کھانے کے بعد لوگوں نے پوچھا "اے عبد المطلب، آپ نے اپنے جس بیٹے کے لیے ہماری یہ ضیافت کی ہے اس کا نام کیا رکھا ہے؟" انہوں نے کہا میں نے اس کا نام محمدؐ رکھا ہے۔ لوگ کہنے لگے آپ نے اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کے ناموں سے مختلف نام کیسے رکھ دیا؟ عبد المطلب نے کہا میں چاہتا ہوں کہ آسمان میں

---

[۱] لفظ محمدؐ تو پہلے بھی عرب میں شاذ و نادر بعض لوگوں کا نام تھا مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ پہلے کسی کا نام احمد ہو۔

[۲] یہ عقیقہ بھی بقایائے دین ابراہیمی میں سے تھا جو زمانۂ جاہلیت میں بھی اہل عرب کے ہاں رائج رہا۔

اللہ اور زمین میں خلق اس کی تعریف کرے۔

غربت سے زندگی کی ابتدا جناب عبداللہ شادی کے وقت نوجوان ہی تھے اور اپنے کاروبار کی انہوں نے ابتدا ہی کی تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے وہ اپنے یتیم بچے اور اپنی بیوہ کے لیے کوئی بڑی دولت چھوڑ کر نہ جا سکے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ انہوں نے پانچ اونٹ، بکریوں کا ایک ریوڑ، اور ایک لونڈی ترکہ میں چھوڑی تھی[۵]۔ لونڈی وہی اُمّ ایمن رضی اللہ عنہا تھیں جنہوں نے بڑی محبت سے حضورؐ کو پالا۔ ان کا اصل نام برکہ تھا اور حبشی النسل تھیں۔ بعد میں حضورؐ نے ان کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بن حارثہ سے کیا جن سے اُسامہؓ بن زید پیدا ہوئے۔

حیاتِ طیبہ کی اسی غریبانہ زندگی کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے کہ:

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ (الضحیٰ۔ ۸) اور اللہ نے تم کو غریب پایا پھر غنی کر دیا

رضاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً چند روز تک ابولہب کی لونڈی ثُوَیبہ کا دودھ پیا۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ اسی کا دودھ حضرت ابُو سلمہؓ (ام المومنین امّ سلمہ کے پہلے شوہر) نے بھی پیا تھا۔ ابن سعد اور ابن ہشام کا بیان ہے کہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عبداللہ بن جحشؓ (امّ المومنین حضرت زینبؓ) کے بھائی نے بھی اسی کا دودھ پیا تھا، اس لیے یہ حضرات حضورؐ کے رضاعی بھائی تھے۔ اسی خدمت کے صلہ میں حضورؐ جوان ہونے کے بعد ہمیشہ ثُوَیبہ کے ساتھ حسن سلوک فرماتے رہتے تھے اور حضورؐ کی شادی ہونے کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی اس کی تکریم اور اس کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرتی تھیں۔ پھر حضرت خدیجہ نے چاہا کہ اسے خرید کر آزاد کر دیں۔ مگر ابولہب نے انکار کیا۔ بعد میں اس نے خود ہی اُسے آزاد کر دیا۔ ہجرت کے بعد بھی آپ مدینہ سے اس کے لیے کپڑا اور خرچ بھیجا کرتے تھے۔ ۷ھ میں آپ کو اس کی وفات کی خبر ملی تو آپ نے اس کے بیٹے مسروح کا حال دریافت کیا جس نے آپ کے ساتھ اس کا دودھ پیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی مر گیا اور اس کا دنیا میں کوئی باقی نہ رہا۔

حلیمۂ سعدیہ شرفائے مکہ کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے لیے صحرائی علاقوں کے اچھے قبائل میں بھیج دیتے تھے تاکہ عمدہ آب و ہوا میں پرورش پائیں اور خالص عربی سیکھ لیں۔ اس غرض کے لیے باہر کے قبیلوں کی عورتیں وقتاً فوقتاً مکہ آتی تھیں اور سرداروں کے بچے لے جاتی تھیں جن سے ان کو معقول معاوضے ملتے تھے اور بعد میں بھی حسن سلوک کی توقع ہوتی تھی۔ اسی سلسلہ میں حضورؐ کی ولادت کے کچھ مدت بعد بنی سعد بن بکر (قبیلہ

---

[۵] ایک روایت یہ بھی ہے کہ ترکہ میں صرف ایک اونٹ تھا اور ایک لونڈی۔

ہوازن کی ایک شاخ) کی کچھ عورتیں بچے لینے کے لیے مکہ گئیں جن میں حلیمہ بنت ابی ذؤیب بھی اپنے شوہر حارث بن عبداللہ کے ساتھ شامل تھیں۔ ابن ہشام نے حلیمہ کا اپنا بیان نقل کیا ہے کہ ہم بہت خستہ حال تھے۔ ہمارا علاقہ قحط زدہ تھا۔ دوسری عورتوں کی بہ نسبت ہماری حالت زیادہ ہی خراب تھی۔ ہماری گدھی اس قدر کمزور تھی کہ قافلے کے پیچھے رہ جاتی تھی۔ ہماری اونٹنی بھی ذرا دودھ نہ دیتی تھی۔ میری چھاتیوں میں بھی دودھ اتنا کم تھا کہ میرے بچے کا پیٹ نہ بھر سکتا تھا۔ رات بھر روتا رہتا تھا اور ہم نہ سو سکتے تھے۔ مکہ پہنچے تو کوئی عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لینے پر راضی نہ ہوئی۔ ہر ایک کہتی تھی کہ یتیم ہے۔ باپ ہوتا تو ہم اس سے کچھ حسن سلوک کی امید رکھتے۔ بیوہ ماں اور دادا سے معلوم نہیں کچھ ملے یا نہ ملے۔ دوسری سب عورتوں نے دوسرے بچے لے لیے اور مجھے کوئی بچہ نہ ملا۔ جب سب واپس چلنے کے لیے تیار ہوئیں تو میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ میں خالی ہاتھ جانا پسند نہیں کرتی۔ جا کر اُسی یتیم بچے کو لیے لیتی ہوں۔ شوہر نے کہا کیا مضائقہ ہے اگر تو ایسا کرے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ اُسی میں ہمیں برکت دے دے۔ چنانچہ میں گئی اور صرف اِس لیے اُس بچے کو لے لیا کہ کوئی اور بچہ مجھے نہ ملا تھا۔ اپنے پڑاؤ پر پہنچ کر اُس بچے کے منہ میں اپنی چھاتی دی تو اتنا دودھ اترا کہ وہ بھی سیر ہو گیا اور اس کے دودھ شریک بھائی نے بھی (جس کا نام عبداللہ تھا) خوب پیٹ بھر کر پی لیا۔ پھر میرے شوہر نے اونٹنی کا دودھ نچوڑنا شروع کیا تو اس نے اتنا دودھ دیا کہ ہم دونوں اچھی طرح سیر ہو گئے اور رات ہم نے بڑے آرام سے گزاری۔ صبح میرے شوہر نے کہا خدا کی قسم، حلیمہ، تو نے تو بڑا ہی مبارک بچہ لیا ہے۔

حلیمہ کہتی ہیں کہ واپسی کے سفر میں ہماری گدھی کی شان ہی کچھ اور تھی۔ قافلے کے سارے گدھوں کو اس نے پیچھے چھوڑ دیا۔ میری ساتھی عورتیں کہنے لگیں کہ حلیمہ، کیا یہ تیری وہی گدھی ہے جس پر تو ہمارے ساتھ آئی تھی؟ میں نے کہا ہاں۔ وہ بولیں، واللہ، اس کی تو حالت ہی بدلی ہوئی ہے۔ ہم وطن واپس پہنچے تو زمین پر شاید ہی کوئی علاقہ اُس وقت اتنا اُجاڑ ہو جتنا ہمارا تھا۔ مگر میری بکریاں جہاں جاتیں پیٹ بھر کر چارہ کھاتیں اور خوب دودھ دیتیں۔ اس طرح ہم روز بروز اُس بچے کی برکتیں زیادہ ہی دیکھتے رہے۔ دو سال گزرے اور دودھ چھڑانے کا وقت آیا تو وہ بچہ سارے قبیلے کے بچوں سے زیادہ تندرست و توانا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے چار برس کا ہو۔ ہم اسے مکہ اس کی ماں کے پاس واپس لے گئے، مگر ہمارا جی چاہتا تھا کہ وہ ہمارے پاس کچھ مدت اور رہے۔ میں نے اس کی ماں سے کہا کہ میرے اس بیٹے کو میرے پاس ابھی اور رہنے دو تا کہ یہ خوب پل کر تنومند ہو جائے مجھے اندیشہ ہے کہ مکہ کی خراب آب و ہوا اس کی صحت پر برا اثر نہ ڈالے۔ غرض

میں نے اتنا اصرار کیا کہ وہ اسے پھر میرے ساتھ بھیجنے پر راضی ہو گئیں۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ اس طرح حضورؐ دو سال اور حلیمہ کے ہاں رہے۔ مگر ابن اسحاق کی روایت اس سے مختلف ہے جو ہم آگے نقل کرتے ہیں۔

شق صدر حلیمہ کا بیان ہے کہ واپس آکر ہم ابھی دو تین ہی مہینے رہے تھے کہ ایک روز وہ بچہ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ ہمارے گھروں کے پیچھے ہماری بکریوں میں تھا۔ اتنے میں اس کا بھائی دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ میرے اُس قریشی بھائی کے پاس دو سفید پوش آدمی آئے اور انہوں نے اس کا پیٹ چاک کر دیا۔ میں اور میرا شوہر دونوں بھاگتے ہوئے گئے تو دیکھا کہ وہ بچہ کھڑا ہوا ہے اور اس کا رنگ فق ہے۔ اس کے باپ نے اسے لپٹا لیا اور پوچھا بیٹا تجھے کیا ہوگیا؟ اس نے کہا دو آدمی سفید کپڑے پہنے ہوئے آئے، مجھے لٹا کر میرا پیٹ چاک کیا اور اس میں سے کوئی چیز نکال کر پھینک دی اور پیٹ کو پھر ویسا ہی کر دیا جیسا وہ تھا (دوسری روایت میں یہ ہے کہ وہ میرے پیٹ میں کوئی چیز تلاش کرتے رہے، معلوم نہیں وہ کیا چیز تھی)[۵]۔ حلیمہ کہتی ہیں کہ ہم اسے گھر واپس لائے تو میرے شوہر نے کہا، حلیمہ مجھے ڈر ہے کہ اس بچے کو کچھ ہو نہ جائے، بہتر یہی ہے کہ اسے اس کے گھر پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ ہم اسے اس کی ماں کے پاس مکہ لے گئے۔ انہوں نے کہا "انّا، تم کیسے اس کو واپس لے آئیں، تم تو اسے اپنے پاس رکھنے کے لیے بڑی حریص تھیں"۔ میں نے کہا "اللہ نے اب بچے کو خوب پال کر بڑا کر دیا ہے اور میری جو ذمہ داری تھی وہ میں نے پوری کر دی ہے۔ اب مجھے اندیشہ ہے کہ اسے کچھ حوادث پیش نہ آجائیں"۔ بی بی آمنہ نے کہا "اصل بات کیا ہے، مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ"۔ حلیمہ نے ان کے اصرار پر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ انہوں نے کہا کیا تمہیں اس بچے کے معاملہ شیطان کا خوف ہے؟ حلیمہ نے کہا ہاں۔ انہوں نے کہا "خدا کی قسم شیطان کے لیے اس پر کوئی راہ نہیں، میرے اِس بچے کی بڑی شان ہے"۔ پھر بی بی آمنہ نے حلیمہ کو زمانۂ حمل کے واقعات اور پیدائش کے وقت کے حالات بتائے۔

بچپن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس قیامِ صحراء کی وجہ سے آپ کی عربی زبان نہایت فصیح ہو گئی تھی، کیونکہ آپ قریشی تھے اور بنی سعد میں آپ نے بچپن گزارا تھا جن کی زبان ٹھیٹھ عربی تھی۔ اسی بناء

---

[۵] واضح رہے کہ یہ شقِ صدر کا واقعہ اَسرارِ الٰہی میں سے ہے جس کی کُنہ کو انسان نہیں پہنچ سکتا۔ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایسے عجیب واقعات بے شمار پیش آئے ہیں جن کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ لیکن توجیہ کا ممکن نہ ہونا اس کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ان کا انکار کر دیا جائے۔

پر آپ فرمایا کرتے تھے:

أنا أعربكم، أنا قرشي واسترضعت في بني سعد بن بكر۔ — میں تم میں سب سے زیادہ عربی داں ہوں، میں قریشی ہوں اور بنی سعد بن بکر میں میری رضاعت کا زمانہ گزرا ہے۔

حلیمہ کے ساتھ بھی ثُوَیبہ کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نہایت محبت اور احسان کا برتاؤ فرماتے رہے۔ حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کی شادی ہونے کے بعد ایک مرتبہ وہ آئیں اور انہوں نے شکایت کی کہ ہمارے علاقہ میں سخت قحط ہے اور مویشی مر گئے ہیں۔ آپ نے ان کو ۴۰ بکریاں اور سامان سے لدا ہوا ایک اونٹ مرحمت فرمایا۔ ابن سعد نے محمد بن مُنکدِر کی روایت نقل کی ہے کہ ایک عورت نے حضورؐ کے پاس حاضر ہونے کی اجازت مانگی جس نے بچپن میں آپ کو دودھ پلایا تھا۔ وہ آئی تو آپ میری ماں، میری ماں کہتے ہوئے اٹھے اور اپنی چادر بچھا کر اسے بٹھایا۔ غزوۂ ہوازن کے موقع پر جو لوگ قید ہو کر آئے تھے ان میں حلیمہ کی وہ لڑکی شیماء بھی شامل تھی جو بچپن میں حضورؐ کو گود میں لیے پھرتی تھی۔ آپ نے اسے پہچان لیا، بہت مہربانی کے ساتھ اس سے پیش آئے اور عزت کے ساتھ اس کے خاندان والوں کے پاس بھیج دیا۔ ہوازن کے وفد نے جب آپ سے رحم کی درخواست کی اور کہا کہ ان قیدیوں میں آپ کی خالائیں بھی ہیں، آپ کی اناّئیں بھی ہیں جنہوں نے بچپن میں آپ کو گود میں کھلایا ہے تو آپ نے فرمایا جو میرا اور بنی عبدالمطلب کا حصہ ہے وہ میں نے چھوڑا۔ انصار نے کہا جو ہمارا حصہ ہے وہ ہم نے اللہ اور رسول کے لیے چھوڑ دیا۔ اس طرح ۶ ہزار قیدی رہا کر دیے گئے اور جو مال ان کو واپس دیا گیا اس کی قیمت ۵۰ کروڑ درہم تھی۔ حضور کے بعد حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بھی اس خاندان کا خاص لحاظ رکھتے اور اس سے حسن سلوک اور تکریم کے ساتھ پیش آتے رہے۔

والدہ ماجدہ کا انتقال ابن سعد اور ابن اسحاق کا بیان ہے کہ آپؐ ۶ سال کے تھے، اور ابن حزم اور ابن القیم کا بیان ہے کہ ابھی آپ کا ساتواں سال پورا نہ ہوا تھا کہ بی بی آمنہ آپ کی پردادی (جناب عبدالمطلب کی والدہ) کے خاندان بنی عدی بن نجار سے ملانے کے لیے آپ کو اُمّ اَیمن کے ساتھ مدینے گئیں اور ایک مہینہ وہاں رہیں۔ انہوں نے وہ مکان آپ کو دکھایا جہاں آپ کے والد جناب عبداللہ کا انتقال ہوا تھا۔ وہ جگہ دکھائی جہاں وہ مدفون تھے۔ اس سفر کے واقعات آپ کو بعد میں اچھی طرح یاد رہے۔ ہجرت کے بعد جب آپ مدینہ تشریف لے گئے تو آپ اپنے اصحاب کو اس پہلے سفر مدینہ کے حالات سناتے تھے جو آپ نے اس چھوٹی عمر میں اپنی والدہ ماجدہ

کے ساتھ کیا تھا۔ بنی عدی بن نجار کی گڑھی کو دیکھ کر آپ فوراً اسے پہچان گئے۔ فرمایا یہاں میں انصار کی ایک لڑکی اُنیسہ کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور اپنے دادا کی ننھیال کے لڑکوں کے ساتھ یہاں اترنے والے پرندوں کو اڑایا کرتا تھا۔ دار النابغہ کو دیکھ کر فرمایا یہاں میں اپنی والدہ کے ساتھ اُترا تھا اور اسی گھر میں میرے والد کی قبر ہے۔ میں نے بنی عدی بن نجار کے کنوئیں میں تیراکی کی خوب مشق کر لی تھی۔

اس کے بعد جب آپ کی والدہ صاحبہ آپ کو لے کر مکہ روانہ ہوئیں تو اَبواء کے مقام پر ان کا انتقال ہو گیا اور وہیں وہ دفن ہوئیں۔ اُم اَیمن حضورؐ کو لے کر مکہ واپس پہنچیں۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضورؐ کو وہ جگہ بھی یاد تھی جہاں آپ کی والدہ دفن ہوئی تھیں۔ چنانچہ عمرۂ حُدیبیہ کے موقع پر جب آپ اَبواء پر سے گزرے تو فرمایا:

ان اللہ قد اذن لمحمد فی زیارۃ قبر امہ — اللہ نے محمدؐ کو اپنی ماں کی قبر پر جانے کی اجازت دیدی ہے۔

پھر آپ وہاں تشریف لے گئے، قبر کو درست کیا اور بے اختیار رو دیے۔ آپ کو دیکھ کر مسلمان بھی رونے لگے۔ عرض کیا گیا کہ آپ تو رونے سے منع فرماتے ہیں۔ فرمایا:

ادرکتنی رحمتھا فبکیت۔ — اُن کی مامتا مجھے یاد آگئی اور میں رو دیا۔

اپنی والدہ ماجدہ کی قبر پر حضورؐ کے تشریف لے جانے اور آپ کے اوپر رقت طاری ہونے کا ذکر متعدد احادیث میں بھی آیا ہے جو مُسند احمد، مسلم، بیہقی اور طبقات ابن سعد میں حضرت بُریدہؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہوئی ہیں۔

جناب عبدالمطلب کی کفالت میں بی بی آمنہ کے بعد حضورؐ کے دادا جناب عبدالمطلب نے آپ کو اپنے ساتھ رکھا اور اپنی تمام اولاد سے بڑھ کر آپ کو چاہا۔ وہ آپ کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اپنے قریب بٹھاتے تھے۔ آپ جس وقت چاہتے ان کے پاس چلے جاتے تھے خواہ وہ تخلیہ میں ہوں یا سوئے ہوئے ہوں، حالانکہ ان کی دوسری اولاد ان کی ہیبت کی وجہ سے یہ جرأت نہ کر سکتی تھی۔ وہ اُس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک آپ اس میں شریک نہ ہوں۔ کعبہ کی دیوار کے سایہ میں ان کے لیے ایک فرش بچھایا جاتا تھا جس پر ان کے ادب کی وجہ سے ان کی اولاد میں سے کوئی نہ بیٹھتا تھا بلکہ سب اس کے ارد گرد بیٹھا کرتے تھے۔ مگر حضورؐ جو اس وقت ایک خوب تنومند لڑکے تھے آکر سیدھے اُسی فرش پر بیٹھ جاتے تھے۔ آپ کے چچا آپ کو ہٹانا چاہتے تو عبدالمطلب کہتے "میرے بیٹے کو چھوڑ دو، خدا کی قسم اس کی شان ہی کچھ اور ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ یہ ایسے

بلند مرتبے پر پہنچے گا جس پر اس سے پہلے کوئی عرب نہیں پہنچا" (بعض روایات میں ہے کہ عبدالمطلب کہتے اس کا مزاج شاہانہ ہے)، پھر وہ آپ کو اپنے پاس بٹھا کر آپ کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے اور آپ کی حرکات و سکنات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ بعض قیافہ شناسوں نے عبدالمطلب سے کہا تھا کہ مقام ابراہیم پر قدم کا جو نشان ہے اِس بچے کا قدم اُس سے بہت مشابہ ہے۔

لیکن دادا کی یہ شفقت بھی حضورؐ کو زیادہ دیر تک حاصل نہ رہی۔ آپ آٹھ سال کے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ابن سعد اور حافظ سخاوی نے اُمّ اَیمَن کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ جب ان کا انتقال ہو رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سرہانے کھڑے رو رہے ہیں۔ بعد کے زمانے میں جب حضورؐ سے پوچھا گیا کیا آپ کو اپنے دادا صاحب کی وفات یاد ہے؟ تو آپ نے فرمایا ہاں، میں اس وقت آٹھ برس کا تھا۔

جناب ابو طالب کی کفالت میں

عبدالمطلب کی وفات کے بعد بعض روایات کی رو سے اُن کی وصیت کے مطابق، اور بعض دوسری روایات کے مطابق بطور خود ابو طالب نے حضورؐ کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ ان کا اصل نام عبد مَناف تھا، مگر اپنے بڑے بیٹے طالب کی وجہ سے ان کی کنیت ابو طالب اتنی مشہور ہوئی کہ اصل نام اس کے نیچے دب گیا۔ یہ لڑکا حضورؐ کا تقریباً ہم عمر تھا اور اس کو حضورؐ سے بے انتہا محبت تھی۔ جنگ بدر میں جب قریش کے لوگ بنی ہاشم کو مجبور کر کے لڑنے کے لیے لے گئے تو ان میں طالب بھی تھا، لیکن اس نے جنگ میں کوئی حصہ نہ لیا اور بعد میں نہ مقتولوں میں اس کا کہیں پتہ چلا نہ زخمیوں میں، اور نہ وہ مکہ واپس پہنچا۔ پھر کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں چلا گیا۔

ابو طالب حضورؐ کے حقیقی چچا تھے۔ انھوں نے آپ کو خود اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر عزیز رکھا۔ اپنے پاس سُلاتے تھے۔ جہاں جاتے ساتھ لے جاتے تھے۔ کھانے کے وقت کوشش کرتے تھے کہ پہلے آپ آکر شریک ہوں تب دوسرے کھانا شروع کریں۔ واقدی نے مختلف سندوں کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ابو طالب کے اہل و عیال اگر حضورؐ کے بغیر کھانا کھاتے، خواہ الگ الگ کھائیں یا مل کر، کسی کا پیٹ نہ بھرتا، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ کھاتے تو سب کا پیٹ بھر کر بھی کھانا بچ رہتا۔ آپ کی یہ برکت دیکھ کر ابو طالب نے قاعدہ بنا لیا کہ جب سب کھانے کے لیے بیٹھتے تو وہ کہتے کہ ٹھیر جاؤ جب تک میرا بیٹا نہ آجائے۔ پھر جب حضورؐ آجاتے تو کھانا شروع کیا جاتا، اور ابو طالب کہتے کہ بیٹے تم بڑے مبارک ہو۔ کھانے پر حسب قاعدہ جب بچے چھین جھپٹ کرنے لگتے تھے تو حضورؐ ہاتھ روک کر بیٹھ جاتے۔ ابو طالب

یہ حال دیکھ کر آپ کے لیے الگ کھانا نکال کر دینے لگے۔ ابو طالب کے لیے الگ مسند بچھائی جاتی تھی جس پر کوئی اور نہ بیٹھتا تھا، مگر حضورؐ ان کے ساتھ ہی جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ اس پر ابو طالب کہا کرتے کہ رب ربیعہ کے خدا کی قسم، میرے اس بھتیجے پر سرداری سجتی ہے۔"

حضورؐ کا بکریاں چرانا

غالباً یہ اسی دور کا واقعہ ہو گا کہ آپ نے چچا کی کمزور مالی حالت اور کثیر العیالی کو دیکھ کر خود کچھ کمانے کی فکر کی ہو گی۔ بچپن میں جب آپ اپنی رضاعی والدہ کے ہاں تھے تو اپنے دودھ شریک بھائی بہنوں کے ساتھ ان کے گھر کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ یہی کام ہوش سنبھال کر آپ نے مکہ میں اُجرت پر کرنا شروع کر دیا۔ حدیث میں عُبَید بن عُمَیر کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک دفعہ فرمایا کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ لوگوں نے عرض کیا کیا آپ نے بھی چرائی ہیں؟ فرمایا ہاں۔ دوسری روایت بخاری کتاب الاجارہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی ہے جس میں اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا میں اہلِ مکہ کی بکریاں کچھ قراریط کے بدلے چرایا کرتا تھا (قراریط قیراط کی جمع ہے جو ایک دینار کے دسویں یا بیسویں حصے کو کہتے تھے)۔ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیلو کے درختوں میں سے گزرے تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کے جو پھل سیاہ ہو گئے ہوں وہ توڑو کیونکہ جب میں بکریاں چراتا تھا اُس زمانے میں یہی پھل توڑا کرتا تھا۔ (ابن سعد، طبع لندن، ص ۷۹-۸۰)

ابتدائے عمر سے آپ کی غیر معمولی شخصیت کا اظہار

اوپر حضورؐ کی پیدائش کے وقت سے ۱۰-۱۲ برس کی عمر تک کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان سے یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ بچپن ہی سے جن لوگوں کو آپ سے سابقہ پیش آ رہا تھا اُن کے ذہن پر یہ نقش ثبت ہوتا چلا گیا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی شخصیت ہے جو ان کے درمیان پیدا ہوئی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ آپ کی ذات سے عجیب عجیب برکات کا ظہور ہو رہا تھا، بلکہ آپ کی عادات و خصائل عام بچوں سے بالکل مختلف تھیں، اور آپ کے بشرے سے بھی آپ کی شخصیت کا غیر معمولی پن نمایاں ہو رہا تھا۔

بیہقی اور ابن جریر نے حضرت علی کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا میرے اندر دو مرتبہ سے زیادہ کبھی اُن کاموں سے دلچسپی پیدا نہیں ہوئی جو اہل جاہلیت کیا کرتے تھے، اور دونوں مرتبہ اللہ عز و جل نے مجھے ان سے محفوظ رکھا اور اس کے بعد پھر میرے دل میں ان کا خیال تک نہ آیا۔ ایک روز میں نے اُس لڑکے سے جو میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتا تھا، کہا کہ تو ذرا میری بکریوں کی دیکھ بھال کرتا کہ میں مکہ میں جا کر رات کی اُن دلچسپیوں

میں حصہ لوں جن میں دوسرے لڑکے حصہ لیتے ہیں۔ وہ راضی ہوگیا۔ چنانچہ میں شہر کی طرف چلا اور میں نے پہلے ہی گھر میں گانے بجانے کی آوازیں سنیں۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ فلاں اور فلاں کی شادی ہے۔ میں بیٹھ گیا اور یکایک مجھے نیند آگئی یہاں تک کہ دن نکل آیا اور سورج کی گرمی سے میری آنکھ کھلی۔ میں واپس گیا تو میرے ساتھی نے حال پوچھا۔ میں نے اسے ماجرا سنا دیا۔ دوسری رات میں نے اپنے ساتھی سے پھر وہی بات کہی اور اس نے مان لی۔ میں مکہ میں داخل ہوا تو وہی گانا بجانا پھر ہو رہا تھا۔ میں یہ تماشا دیکھنے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ پھر سو گیا اور دن نکلنے تک سویا رہا۔ واپس جا کر میں نے اپنے ساتھی کو بتا دیا کہ آج بھی میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس کے بعد میرے اندر اس طرح کی کسی چیز کی طرف میلان ہی پیدا نہ ہوا۔

ابن سعد نے اُمّ ایمنؓ کی روایت نقل کی ہے کہ بُوانہ ایک بُت تھا جس کی زیارت کے لیے قریش کے لوگ جایا کرتے تھے، وہاں نذریں اور نیازیں چڑھاتے تھے، پورے ایک دن اس کے استھان میں اعتکاف کیا جاتا تھا اور پھر قربانی کر کے سر منڈواتے جاتے تھے۔ ابو طالب بھی اس طریقہ کے مطابق اپنے خاندان کے ساتھ وہاں جایا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جو اُس وقت ایک نوخیز لڑکے تھے، آپ سے بھی کہا جاتا تھا کہ آپ سب کے ساتھ چلیں۔ مگر ہر سال یہی جھگڑا ہوتا تھا کہ آپ ساتھ جانے سے انکار کر دیتے اور اس پر آپ کے چچا اور پھوپھیاں سخت ناراض ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ آپؐ گھر کے بڑوں کی اس ملامت اور فضیحتے سے تنگ آ کر اس تہوار کے موقع پر چلے گئے اور بڑی دیر تک کہیں غائب رہے حتیٰ کہ سب گھر والے آپ کے لیے پریشان ہو گئے۔ واپس آئے تو سخت خوف زدہ تھے اور چہرے کا رنگ فق تھا۔ پھوپھیاں آپ کو دیکھ کر لپکیں اور پوچھا، بچے تجھے یہ کیا ہوگیا؟ آپ نے فرمایا مجھے ڈر ہے کہ مجھے کچھ ہو نہ جائے۔ پھوپھیوں نے کہا "اللہ تجھے کبھی شیطان کے شر میں مبتلا نہ کرے گا جب کہ تیرے اندر ایسی اور ایسی خوبیاں ہیں۔" آپ نے کہا جب کبھی میں اس بت خانے میں کسی بت کی طرف جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی گورے رنگ کا لمبا تڑنگا آدمی کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ "اے محمدؐ، دور رہو، اسے مت چھونا۔" اُمّ ایمن کہتی ہیں کہ اس کے بعد آپ کبھی اس تہوار میں نہیں گئے۔

ابن ہشام کا بیان ہے کہ مکہ میں قبیلۂ لہب (اَزدِ شَنُوءَۃ کی ایک شاخ) سے تعلق رکھنے والا ایک ماہرِ علمِ قیافہ آیا اور قریش کے بہت سے لوگ اپنے اپنے لڑکوں کو اس کے پاس لے گئے تاکہ وہ ان کے قیافے سے ان کے متعلق کچھ بتائے۔ ابو طالب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے لڑکوں کے ساتھ لے گئے۔

اس نے آپ کو دیکھا اور پھر کسی اور طرف مشغول ہو گیا۔ اُدھر سے فارغ ہو کر اس نے کہا اُس لڑکے کو لاؤ جسے ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا تھا۔ ابوطالب نے جب دیکھا کہ وہ آپؐ کو دیکھنے کے لیے بڑی بے تابی کا اظہار کر رہا ہے تو انہوں نے آپؐ کو غائب کر دیا۔ اس نے کہا اسے میرے پاس لاؤ، خدا کی قسم وہ بہت بڑا آدمی بننے والا ہے۔

محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک روز قریش کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے میں بھی پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہا تھا اور سب لڑکوں نے پتھر اٹھانے کے لیے اپنی اپنی ازار (تہمت) اٹھا کر گلے میں باندھ رکھی تھی جس سے سب ننگے ہو جاتے تھے۔ میں نے جو ایسا کیا تو یکایک مجھ پر ایک زور کا گھونسا پڑا اور مجھ سے کسی نے کہا کہ "اپنی ازار باندھو" چنانچہ میں نے اپنی ازار باندھ لی۔ اس طرح لڑکپن ہی میں آپ کو عریانی سے روک دیا گیا۔ اسی سے ملتی جلتی صورت اُس وقت پیش آئی جب ۳۵ عام الفیل میں (جبکہ حضورؐ ۳۵ سال کے تھے اور آپ کے نبوت پر سرفراز ہونے میں ابھی پانچ سال باقی تھے) قریش نے از سر نو کعبہ کی تعمیر شروع کی۔ اس موقع پر بھی قریش کے سب لوگ اپنی اپنی ازاریں گلے میں باندھے پتھر ڈھو ڈھو کر لا رہے تھے اور بڑے چھوٹے کسی کو برہنگی کا احساس تک نہ تھا۔ حضرت عباسؓ نے حضورؐ سے کہا آپ بھی ایسا کریں۔ مگر آپ نے ایسا کیا ہی تھا کہ آپ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑے اور نظریں آسمان پر جم گئیں۔ پھر آپ نے فرمایا "میری ازار"۔ چنانچہ وہ باندھ دی گئی تب آپ اٹھے۔ یہ واقعہ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے صحیحین میں نقل ہوا ہے۔

(باقی)

حدود اللہ کی حکمت، سامراجی دور میں ان کا خاتمہ اور اب ان کی ضرورت

(۲)

(جناب حبیب ریحان صاحب ندوی، لکچرار اسلامک انسٹی ٹیوٹ - البیضاء، لیبیا)

اصلاح انسانی کا اسلامی طریقہ

اسلامی نظام اخلاق اور قانون حیات سب سے پہلے انسان اور سوسائٹی کی اصلاح ان خطوط پر کرتا ہے کہ اس کے قلب و نظر میں مادہ کے شیطان کے بجائے روح کے خالق خدائے وحدہ لا شریک لہ کا تصور بٹھاتا ہے، اور اس تصور کے لیے وہ شرک کی آمیزش کو پسند نہیں کرتا کہ تصورِ خالق کے بجائے تصور مخلوق کی تعلیم سے ابتدا کرے۔ رسولِ پاک[۲] نے براہِ راست خدا کا تصور پیدا کیا تھا حتیٰ کہ تصور رسول تک تربیتی طریقے کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا تھا، کیونکہ ربانی طریقہ تربیت یہی تھا، اور رسول خدا کو حکم بھی اسی کا ملا تھا۔ "وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (بقرہ - ۱۸۶) کا مطلب بھی یہی ہے[۱]" "مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ" (البینہ - ۵) کا مفہوم بھی یہی ہے[۲]، "وَلَا نَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا

---

[۱] پوری آیت اور ترجمہ یہ ہے:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ	اور اگر تم سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو میں
قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا	نزدیک ہی ہوں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا
دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ	ہوں جب وہ پکارے، پس انہیں چاہیے کہ میرا
وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ	ہی حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ راہ ہدایت پائیں۔

[۲] پوری آیت اور ترجمہ یہ ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ	اور اُن کو صرف یہی حکم ملا تھا کہ عبادت کریں اللہ کی (باقی اگلے صفحہ پر

يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظّٰلِمِينَ وَإِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ" (یونس ۱۰۵ - ۱۰۷) کا تقاضا بھی یہی ہے[۳]۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اس آخری آیت کا خطاب افضل البشر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ حالانکہ یہ ظاہر بات ہے کہ رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نہ شرک کر سکتے تھے اور نہ ظلم، اس لیے اس آیت میں بہت بلیغ طریقے پر امت کو شرک کی ہر آمیزش سے باز رہنے کا صریح حکم دیا گیا ہے، اور یہ حقیقت بھی واضح طور پر بتائی گئی ہے کہ اگر عفو کا حق، خیر پہنچانے اور شر دور کرنے کا حق کسی بھی بشر کو مل سکتا تھا تو وہ افضل البشر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتے تھے۔ جب آپ کو بھی یہ حق عطا نہیں کیا گیا بلکہ یہ صرف خدا کی قدرت میں ہے، تو پھر کسی بھی دوسرے شخص کے لیے اس کا دعویٰ کرنا یا عقیدہ رکھنا سخت نادانی اور محرومی کی بات ہے۔ اس لیے اے مسلمانو! صرف اللہ سے مانگو، اور اسی سے توبہ کرو اور اسی کا کامل تصور اپنے دل میں بٹھاؤ، اور اس کی بتائی ہوئی مستقیم راہ پر چلو اور انسانیت کو توحید کی دعوت دو، اور شریعت الٰہیہ کو اخلاص کے ساتھ قائم کرو، اور کچھ کوتاہی اگر ہو جائے تو معافی کے لیے اس کے رحیم و شفیق دربار کے سوا کسی دربار، مسند اور آستانے پر نہ جاؤ۔

کتب حدیث میں ایک دعا وارد ہے جسے حضور رسالتمآب ہر نماز میں تشہد کے بعد اور سلام سے پہلے پڑھا کرتے تھے، اس میں خدائے پاک کی قدرت و عظمت کا بیان ہے اور نفع یا نقصان پہنچانے کے سلسلے میں کسی بھی

بقیہ صفحہ سابقہ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ" خالص کر کے اس کے لیے بندگی کو حنیف بن کر صرف خدا کی راہ مستقیم پر چل کر، اور قائم کریں نماز اور دیں زکوٰۃ اور یہی مضبوط اور سیدھا دین ہے۔

[۳] (۳) آیت کا ترجمہ یہ ہے:

"اور اللہ کے سوا کسی ایسے کو نہ پکارو جو نہ تمہیں نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، اور (بفرض محال) تم ایسا کرو تو اس وقت تم ظالم ہو گے، اور اگر اللہ تم کو کوئی تکلیف پہنچا دے تو اس کو دور کرنے والا اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں، اور اگر وہ تمہارے لیے بھلائی چاہے تو اس کے فضل کو روکنے والا بھی کوئی نہیں۔"

بشر یا غیر اللہ کی نفی اس طرح کی گئی ہے:

"لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر، اللّٰھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منک الجد"

خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں ہے، صرف اسی کی بادشاہت اور ملکیت ہے، اور صرف اسی کے لیے حمد و ستائش ہے اور وہ ہر چیز پہ قادر ہے، اے اللہ جس چیز کو آپ عطا کرنا چاہیں اسے روکنے والا کوئی بھی نہیں ہے، اور جسے آپ روکنا چاہیں اسے دینے والا کوئی نہیں ہے، اور کسی غنی کو اس کی غنا آپ کے مقابلہ میں فائدہ نہیں پہنچا سکتی (یعنی صالح اعمال کام آئیں گے یا پھر تیری رضا و رحمت)۔

نیز حدیث جبریل علیہ السلام میں صاف الفاظ مقام احسان سے متعلق یہ وارد ہوئے ہیں "ان تعبد ربک کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک"۔ مقام احسان کی ابتدا یہ بتائی کہ اس بات پر یقین ہو کہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے اور انتہا یہ بتائی کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو۔ خدا کی رویت اس دنیا میں ان آنکھوں سے اہل سنت کے نزدیک ممکن نہیں۔ اس لیے دیکھنے کے مجازی معنی تصور کرنے ہی کے لیے جائیں گے۔ احسان کی ابتدا، وسط اور انتہا، کسی بھی اسٹیج پہ یہ نہیں بتایا گیا کہ افضل الملائکہ جبریل امین یا افضل البشر، خاتم الرسل والانبیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور اپنے دماغ اور دل میں بٹھاؤ، پھر پتہ نہیں کیسے اور کیوں مخلوق کا تصور مقام احسان کے سالکین کے لیے جائز قرار دیا گیا ہے؟ اور یہ حجت کہ بے شمار تصوروں سے سالک کو ہٹا کر پہلے ایک شیخ کا تصور بٹھا دیا جائے پھر اس کو ہٹا کر خدا کا تصور بٹھانا آسان ہوگا، یہ حجت اگر شرعاً مستحسن ہوتی تو انبیائے کرام کے سلسلۂ ذہب میں سے کسی بھی نبی یا رسول کی تعلیمات میں یہ دعوت ضرور ہوتی کہ اصنام و افکار سے تصور کو ہٹا کر کسی فرشتہ یا نبی کا تصور بٹھاؤ کیونکہ پھر اس کو ہٹا کر خدا کا تصور بٹھانا آسان ہوگا۔ اس کے برعکس تعلیمات انبیا میں ودّ و سُواع یغوث و یعوق و نسر جیسے صالحین کے تصور کو بٹھانے سے جو نقصانات ہوئے ان کی طرف اشارہ ہے، اور قرآنی و نبوی تعلیمات میں کثرت کے ساتھ براہ راست خدا کی عبادت، تصور اور ایمان کی دعوت

دی گئی ہے۔ اور عقلی طور پر بھی یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اور مخلوق کا ناقص تصور جب پختہ ہو جائے تو اس کو ہٹا کر خالق کا لامحدود اور کامل تصور بٹھا دیا جائے کیونکہ دونوں تصوروں میں کوئی مناسبت ہی نہیں یہ انسان کا تصور ہے جو مخلوق، محدود، غیب سے ناواقف، نیند، ضعف، مرض اور موت سے متاثر ہونے والا ہے۔ وہ خدا کا تصور ہے جو خالق، لامحدود، عالم الغیب ہے، نیند ضعف مرض اور موت سے متاثر ہونا تو درکنار ان کو پیدا کرنے والا ہے، اور مختصر عبارت میں یہ کہ "لیس کمثلہ شیئ"۔ تاریخی و عقلی حیثیت سے یہ بات قابل دید و لائق عبرت و بصیرت ہے کہ مسیحی قوموں نے جب ایک بار انسانی تصور پر عقیدہ و اصلاح نفس کی بنیاد رکھ دی تو اب کامل تصور تک پہنچنے کی راہ میں سینکڑوں برس سے عقلی، علمی اور عقائدی اَن گنت مشکلات کا سامنا پورے تصور الوہیت اور دین کو کرنا پڑ رہا ہے، اور مخلوق و عبد سے مجرد ہو کر خالق و معبود کا تصور ان کے ذہنوں میں بیٹھ ہی نہیں پا رہا ہے، اور تاویلات کے چکر اور اسرار کے کبھی نہ حل ہونے والے پھندوں میں وہ گرفتار ہو کر خدا اور دین دونوں ہی کو عملاً خیرباد کہہ چکے ہیں۔

اسلام خدا کے اس تصور کے ذریعے دنیاوی زندگی کا مقصد متعین کرتا ہے اور جانوروں کی طرح کھانا پینا اور مر جانا نہیں بتاتا۔ وہ تصورِ حیات میں پیٹ اور روٹی کا مقام وہی متعین کرتا ہے جو اس کا اصل مقام ہے یعنی قلب و نظر اور عقل و دماغ کے بعد وہ خدا کی رضامندی حاصل کرنا زندگی کی اصل سعادت بتاتا ہے۔ اپنی جان اور مال سب کا مالک وہ خدائے ذوالجلال کو ثابت کرتا ہے۔ پھر مسلمان رسولؐ کی بتائی ہوئی مکمل خدائی تعلیمات پر ایمان و یقین کے ساتھ عمل شروع کر دیتا ہے، اور زندگی کی شاہراہ میں وہ اس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے کہ کہیں خارزارِ راہ سے دامن نہ الجھ جائے۔

اسلامی قانونِ شریعت ہر انسان کے لیے اس کے فطری تقاضوں کو دبانے کے بجائے ان کو جائز طریقوں پر پورا کرنے کے وسیلے بہم پہنچاتا ہے، بلکہ اکثر جگہ ان کو پورا کرنے پر ابھارتا ہے اور غیر فطری زندگی مثلاً رہبانیت اور جوگیت کو غیر اسلامی زندگی ثابت کرتا ہے۔ اسلام ایک مقتول شخص کے ولی کو قصاص عادل کا حق عطا کرتا ہے، ایک نوجوان شخص کو حلال طریقے پر شادی کی رغبت دلاتا ہے، ایک غریب شخص کو محنت اور عمل پر ابھارتا ہے، حکومت پر یہ واجب کرتا ہے کہ وہ ہر غریب، فقیر، مریض، مقروض اور پریشان حال کی دیکھ بھال کرے، اجتماعی تعاون، ہمدردی اور مدد کی اپیل کرتا ہے، اور پوری زندگی کو حسن و جمال سے مربوط بناتا ہے، انسانوں کو آزادی عطا کرتا ہے، اور شورائی و جمہوریت کے تقاضوں سے آشنا بناتا ہے۔

شریعت کی بخشی ہوئی تمام آسانیوں سے اسلامی حکومت کا ہر باشندہ فائدہ اٹھا سکتا ہے	توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے

لیکن اس کے باوجود اگر کسی شخص سے گناہ سرزد ہوتا ہے اور وہ حدود الٰہیہ کو توڑتا ہے اور اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ اپنے ہر گناہ سے توبہ کرنے کے بعد پاک صاف بن سکتا ہے۔ اس کی توبہ کے لیے کسی تیسرے واسطے، شیخ، بزرگ، پیر یا پادری کی مطلق ضرورت نہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۶ جو اوپر لکھی گئی تھی صاف حکم دیتی ہے کہ صرف خدا سے دعا اور توبہ کرو، اور حسب ذیل آیت اس بات کو واضح کرتی ہے کہ گناہ کو بخشنے کا حق صرف خدا کو ہے، اور یہ کہ کسی بڑے سے بڑے فحش گناہ یا اپنے نفس پر ظلم کے بعد بھی اگر اخلاص اور دکھے ہوئے دل کے ساتھ انسان خدا کو یاد کرے اور توبہ کی شرطوں کے ساتھ توبہ کرے جس میں گناہ پر اصرار نہ ہو اور اس پہ ندامت ہو تو خدا اس کو اپنی رحمت و مغفرت سے معاف کر دیتا ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ
ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ
فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ
الذُّنُوبَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلٰى
مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ أُولٰئِكَ
جَزَآؤُهُمْ مَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَ
جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ
فِيهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعٰمِلِينَ ۝

(آل عمران ۱۳۵-۱۳۶)

(جنت جن لوگوں کے لیے بنائی گئی ہے ان میں سے چند کا تذکرہ کرنے کے بعد) اور وہ لوگ (بھی) جو جب کوئی کھلا گناہ کریں یا اپنے حق میں ظلم کریں تو اللہ کو یاد کریں (یعنی غافل اور بدمست نہ ہو جائیں) اور اپنے گناہوں کی بخشش چاہیں۔ اور کون ہے جو گناہوں کو بخشے سوائے اللہ کے؟ اور وہ اپنی بدعملی پر اصرار نہ کریں جانتے ہوئے، ان کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے بخشش ہے اور وہ جنتیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ رہیں گے اس میں، اور عمل کرنے والوں کا اجر (بدلہ) بہت خوب ہے۔

پھر دوسری آیت میں خدائے پاک نے فحش و ظلم کے اس حکم کی عام تشریح اس طرح کی ہے کہ شرک کے سوا ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ گذشتہ آیت میں ظلم سے مراد شرک سے کم درجے کے گناہ ہیں۔ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (نساء - ۱۱۶)	اللہ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کم کو جس کے لیے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔

خدا نے توبہ کا حکم دیا ہے اور گناہ کے بعد توبہ سے مایوسی اور خدا کی رحمت سے قُنُوط (یاس) کی ممانعت کی گئی ہے۔ بلکہ تمام گناہگاروں، خطاکاروں اور نفس بشری کی غلطیوں سے آلودہ ہو جانے والے انسانوں کے لیے مژدۂ بشارت ان کے رب کی طرف سے اس طرح موجود ہے کہ رحمت الٰہی سے مایوس نہ ہو اور توبہ کرو۔ اور توبہ یہی ہے کہ اطاعت کرو اور سب سے اچھی اور کامل شریعت کی پیروی کرو کہ اس آسمانی ہدایت کی پیروی نہ کرنے والے دنیا و آخرت کی حسرتوں سے دوچار ہوں گے۔ چند آیتیں ملاحظہ ہوں۔ گنہگاروں کو کیسا اصلاح و اتباع کا درس دیا گیا ہے، اور یہ درس تمام امت پر واجب ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ، وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۔ (زمر - ۵۳ - ۵۵)	کہہ دو، اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے نفسوں پر (گناہ کے ذریعے) زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بیشک اللہ سارے گناہ بخش دیتا ہے، بیشک وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، اور اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کی حکم برداری کرو، اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آ جائے اور تمہاری مدد کسی طرف سے نہ کی جائے، اور اتباع (پیروی) کرو اس اچھی بات (اسلام، قرآن اور شریعت) کی جو تمہاری طرف اتاری گئی تمہارے رب کی طرف سے، اس سے پہلے کہ اچانک تم پر عذاب آ جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

اس آیت کے ابتدائی حصے میں گنہگاروں کے لیے مغفرت کی بشارت ہے، اور وسط میں اتباع کتاب

الٰہی و شریعت اسلامیہ اور رجوع الی اللہ کی دعوت ہے، اور آیت کے آخری فقرے میں اسلام کی مکمل تابعداری اور شریعت مُنَزَّلہ پر عمل نہ کرنے کی صورت میں اچانک عذاب کی وعید بھی موجود ہے۔ جس طرح افراد کے گناہ دربارِ الٰہی میں توبہ کے ذریعے معاف ہو سکتے ہیں اسی طرح قوموں، امتوں اور مسلم سوسائٹیوں کے گناہ بھی معاف ہو سکتے ہیں۔ صرف شرط یہ ہے کہ گناہ کا پہلے تو اعتراف ہو جائے اور پھر اس پر اصرار نہ ہو۔ گناہ یہ ہے کہ ہمارے ملکوں میں شریعت اسلامیہ کے بجائے انسانی قوانین اور وضعی شریعتیں نافذ ہیں۔ ان کو باقی رکھنے پر اصرار توبہ کے منافی ہے۔ اور اخلاص کے ساتھ شریعت اسلامیہ کا قانون اور خدا کی بتائی ہوئی راہ اگر اپنالی جائے پھر رحمت و مغفرت کے دروازے کھل سکتے ہیں اور سکون و سعادت کے بادل آسمان سے ایسی بارش کر سکتے ہیں کہ کشت زارِ ہستی امید و آرمان کے پودوں سے لہلہا سکتی ہے۔ کُشت و خون کا بازار سرد پڑ سکتا ہے، چوری ڈاکہ اور تمام اخلاقی جرائم کم سے کمتر ہو سکتے ہیں۔

اسلامی نظامِ قضاء میں رحم و کرم کے اصول

جیسا کہ بیان کیا جا چکا، ہر گناہ اور غلطی اور حد تک کی معافی توبہ اور دعا سے ہو سکتی ہے کیونکہ معافی کا حق صرف خدا کو ہے اور بندہ کسی گناہ کے بعد اگر وہ کسی کو معلوم نہیں ہوا ہے اور عدالت تک نہیں پہنچا ہے تو براہِ راست خدا سے توبہ کر سکتا ہے۔ لیکن گناہ اگر اتنی شہرت، ڈھٹائی اور عام طور پر ظاہر کر کے کیا گیا ہے کہ وہ ایک مقدمہ بن کر عدالت تک پہنچ گیا ہے تو اس صورت میں اسلامی شریعت کا اصول یہ ہے کہ وہ مجرم، مجنی علیہ (جو اس جرم سے متاثر ہوا) اور سوسائٹی، تینوں کے ساتھ نرمی، ہمدردی اور انصاف کا برتاؤ کرنا چاہتی ہے، اور ایسے کلّی اصول پیش کرتی ہے جن سے جرم کا انسداد ہو، اور جرم کے تصور ہی سے مجرم کے رونگٹے کھڑے ہوں اور سوسائٹی جرم سے باز رہے۔ قانونی طور پر جرائم کے سلسلے میں تین قانون اسلام نے پیش کیے ہیں۔ ایک قصاص کا قانون۔ دوسرا حدود کا۔ اور تیسرا تعزیرات کا۔ قتل کی صورت میں معافی کا حق حاکم یا عدالت کو نہیں بلکہ مقتول کے ولی الدّم کو رہتا ہے، اور سزا کی تنفیذ کا حق حاکم کو، تاکہ اس طرح دلوں میں نفرت، غصہ اور کینے کے بجائے محبت کی فضا دوبارہ قائم ہو جائے۔ اس طرح دیت دی جا سکتی ہے اور ولیّ الدّم کو خون بہا لینے کا پورا پورا حق شریعت نے دیا ہے۔ تعزیرات وہ جرم ہیں جن کی سزا شریعت میں منصوص (واضح طور پر محدد اور معلوم) نہیں ہے۔ تعزیرات کی دو قسمیں ہیں: اللہ کا حق اور بندوں کا حق۔ اللہ کا حق یہ ہے کہ سوسائٹی میں گناہ اور منکر کو دیکھ کر اس سے باز رکھنے کی کوشش ہر شخص کرے، لیکن قانونی طور پر اضطراب و قلق اور انتظامی خلل کے خطرے

سے تعزیر امام یا عدالت ہی کو نافذ کرنی چاہیے۔ حق الٰہی جیسے نماز کو ترک کرنا اور شرعی اوامر کو ادا نہ کرنا یا گناہ کرنا وغیرہ ان میں "تعزیر امام پر واجب ہے۔ کیونکہ برے افعال پر تادیب اگر نہ کی جائے تو اس سے زیادہ فحش اور قبیح کام کرنے کی ہمت اور عادت ہو جائے گی۔ سرخسی کا قول ہے کہ "اس میں کوئی چیز مقدر (مقرر) نہیں ہے، بلکہ قاضی کی رائے اور مجرم کی نوعیت جرم اور جرم سے باز رہنے اور رک جانے کی صلاحیت دیکھ کر وہ جو چاہے سزا دے سکتا ہے" (فتح القدیر ۴-۲۱۲)۔ تعزیر کی شکلیں اور حدیں فقہ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بندوں کا حق یہ ہے کہ کسی شخص پر کوئی الزام یا تہمت لگائی جائے تہمت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک کسی ایسی چیز کی تہمت جس پر شرعی حد مقرر ہے، خصوصیت کے ساتھ زنا کی تہمت۔ اس کو قذف کہتے ہیں اور شریعت میں اس کی حد مقرر ہے۔ دوسری وہ تہمت جس میں حرام کام کا الزام نہیں لگایا جاتا بلکہ شخصیت مجروح ہوتی ہے، گالی گلوچ، تکلیف پہنچانا، کسی پر خیانت کا الزام یا اس قبیل کی دوسری حق تلفیاں۔ اس تعزیر کا حق بھی امام یا اس کے نائب، عدالت کو ہے۔ لیکن معاف کرنے کا حق عدالت کو نہیں، اُسی کو ہے جس پر تہمت لگائی گئی یا زیادتی کی گئی۔ حدود وہ جرم ہیں جن کی سزائیں کتاب و سنت میں واضح اور محدود و مقرر ہیں۔ ثبوتِ قطعی کے بعد ان میں معافی کا حق نہ حاکم کو ہے نہ عدالت کو اور نہ مجنی علیہ کو۔ اور یہ بات عقلی طور پر بھی صحیح ہے کیونکہ معافی کی صورت میں دوسرے غیر مجرموں کو جرم کی رغبت ہوتی ہے اور جرم کرنے کے بعد جرم کی سزا سے چھوٹ جانے کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ صرف حدِّ حرابہ کے سلسلے میں نص قرآنی کی رو سے اس پر اتفاق ہے کہ حاکم ان کو معاف کر سکتا ہے۔ اور شریعت کی مصلحت اس میں یہ ہے کہ کسی منظم اور مسلح فسادی گروہ پر معافی اور توبہ کا دروازہ کھول کر مزید ظلم و ستم سے اس کو اور عوام کو بچانا مقصود ہے۔ اگر ان کی معافی نہ ہو تو پھر وہ آخر دم تک ہتھیار نہیں ڈالیں گے اور اس طرح فساد کا طوفان مچاتے رہیں گے اور عوام، پولیس اور ان کی جانیں اس ہنگامے اور ضد میں مزید تلف ہوں گی۔ حرابہ کے علاوہ دوسری حدود حاکم یا عدالت معاف نہیں کر سکتی۔ لیکن کیا یہ حدود توبہ سے ساقط ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ اس کی تحقیق تفصیل ان شاءاللہ ایک تفصیلی مقالے میں پیش کروں گا۔

مجرم کے ساتھ نرمی کا برتاؤ شریعت اسلامیہ اس طرح کرتی ہے کہ اگر عدالت کے پاس مقدمہ آنے سے پہلے ہی معاملہ رفع دفع ہو جائے تو بات ختم ہو جاتی ہے۔ عام انسانوں کو چشم پوشی اور معافی کی ترغیب دی گئی ہے۔ گواہی کی شرطیں بہت سخت ہیں۔ مجرم کو کسی بھی قانونی یا فطری چھوٹ سے فائدہ اٹھانے کا

پورا حق ہے۔ حد کو شبہ سے بھی ختم کیا جا سکتا ہے اور اس کی جگہ تعزیر ہو سکتی ہے، یعنی اگر ۹۹ چیزیں مجرم کے خلاف ہیں اور ایک چیز میں شک یا اشتباہ ہے تو حد ختم ہو سکتی ہے۔ اور دوسری ایسی تفصیلی اشیا فقہ اسلامی میں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شریعت نے مجرم کے ساتھ کس قدر نرمی اور احتیاط برتی ہے اور حدود کا قیام کتنا مشکل اور نادر الوقوع ہے۔

مجنی علیہ کے ساتھ رحم و کرم یہ ہے کہ اس کو قانونی طور پر اپنے حقوق طلب کرنے کا پورا پورا حق موجود ہے تاکہ وہ مظلومیت کا نہ شکار ہو اور نہ اسے اس کا احساس ہو کہ اس کی کوئی داد فریاد نہیں ہے۔

اور سوسائٹی کے ساتھ منصفانہ اور رحیمانہ برتاؤ یہ ہے کہ حدود کے قیام سے قبل ہی صرف ان کا اعلان، قانون اسلامی میں اس بات کی ضمانت ہے کہ سوسائٹی میں عامۃ الناس اُن قبائح کے ارتکاب سے باز رہیں گے جن پر حدود نافذ ہوں گی، اور پھر اس جرم کے ظاہر ہونے اور عدالت میں ثابت ہونے کے بعد کسی ایک شخص یا چند افراد پر حد کا قیام اور شرعی سزا کا اجرا پوری سوسائٹی کے لیے عبرت اور سبق آموزی کا ایسا لازوال درس ہوگا جو سینکڑوں قوانین، جیلیں اور دوسری تعزیرات نہیں پیدا کر سکتیں۔ اسلام صاف اور نظیف سوسائٹی پیدا کرنا چاہتا ہے، اور تجربہ ثابت کرتا ہے کہ جب اور جہاں اسلامی حدود اور قوانین نافذ ہوئے ہیں جرموں کی تعداد حیرت انگیز طریقے پر کم ہو گئی ہے، اور جہاں ایسا نہیں ہے وہاں بہشتِ دنیا جہنم زار بن گئی ہے۔

اسلامی حدود پر بربریت کا الزام اور اس کا جواب

اول تو اسلامی قانون کا نام ہی سن کر آزاد خیال بلکہ یوں کہیے کہ مغربی افکار کے غلام اور مشرقی اوہام کے شکار چراغ پا ہو جاتے ہیں، لیکن اسلامی حدود کا نام سن کر تو پریشانی اور حیرانی میں وہ ہسٹیریا کے مریض معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے باوجود وہ اسلام ہی کو ایک بیمار دین ثابت کرنے لگتے ہیں، لیکن اسلوب اور لہجہ ایسا اختیار کرتے ہیں جس سے بظاہر واقعی ہمدردی اور حسن نیت ظاہر ہو، اور بین الاقوامی ضمیر اور مسلمانوں کی رسوائی اور اس نظام میں وحشیت اور بربریت وغیرہ کی دُھائیاں دینے لگتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ وحشیت اور لاقانونیت ہوتی تو اقوام متحدہ میں سعودی عرب کو رکنیت و شمولیت نہ ملتی، اور امریکن جرائم سے عاجز آئے ہوئے اجتماعیات کے ماہر اور اسپیشلسٹ، جرائم کے انسداد کے لیے سعودی عرب کی مثال استحسان اور خوبی کے لہجے میں بار بار پیش نہ کرتے۔ یہ "ہمدرد" یہ بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس طرح سوسائٹی میں ہر طرف لنجے اور لنگڑے نظر آئیں گے۔ حالانکہ اگر بفرض محال ایسا ہو بھی تو وہ اس سے تو بہتر ہے کہ سوسائٹی میں ہر طرف سا ہوکار کے

بھیس میں چور، رشوت خور، قانون شکن، اور اخلاق باختگی کے دلدادے، ظلم و ستم میں درندے، اور مکر و فریب پر فریفتہ لوگ نظر آئیں۔ حالانکہ بات ایسی نہیں ہے، اس سلسلے میں ہم اختصار کے ساتھ دو ہی جواب دے سکتے ہیں جو اسلامی تربیت اور حدود کی حکمت کے سلسلے میں اوپر لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے لیے جو چوری، ڈاکہ، حرام خوری، حرام کاری، شراب نوشی، بلیک، ذخیرہ اندوزی، سود خواری اور ان جیسی رذیلتوں اور غیر اخلاقی حرکات کے خلاف پابندی کو برداشت نہیں کر سکتے اور اسلامی حدود پر اعتراض کرتے ہیں آپ دو جواب اور بھی دے سکتے ہیں۔ ایک عقلی اور ایجابی پہلو رکھتا ہے اور دوسرا واقعاتی اور سلبی پہلو۔ یہ دونوں جواب دوبارہ لکھنے کے بجائے راقم اپنی ایک مطبوعہ کتاب سے پیش کرتا ہے[۱۵] "اس سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ مثال کے طور پر چور کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ چوری کی وجہ سے اکثر گھرانوں کا سکون مٹ جاتا ہے، برسوں کی پونجی لٹ جاتی ہے اور نوبت چور کی طرف سے قتل تک کی آجاتی ہے اور سوسائٹی سے چوری ختم نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف جب اسلامی حدود نافذ تھیں شاذ و نادر ہی چوری ہوتی تھی۔ اور آج بھی دنیا میں سب سے کم چوری کی شرح سعودی عرب میں ہے۔ حیرت نہیں تو اور کیا ہے کہ وحشی، لٹیری اور چوری کی عادی قوم ـــ آج سے پچاس سال قبل کے احوال جاننے والے اس حقیقت سے باخبر ہیں ـــ کس طرح ایماندار اور چوری سے باز رہنے والی بن گئی۔ کوئی صاحب یہ توجیہ نہ کریں کہ مال و زر کے انبار انہیں مل گئے، کیونکہ امریکہ یقیناً سعودی عرب سے زیادہ مالدار، زیادہ تعلیم یافتہ اور عصر حاضر کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ وہاں چوری اور سنگین جرائم کی شرح سب سے زیادہ ہے اور اس کے حساب کے لیے اب منٹ تک ناکافی ہو کر نوبت سیکنڈوں تک آگئی ہے۔ اس کے مقابلے میں شاہ عبدالعزیز ابن سعود کی پوری مدت حکومت چوبیس سال میں صرف سولہ چوری کی وارداتیں ہوئیں، جب کہ عبدالعزیز کا شروع زمانہ فقر و مصائب اور مشاکل کا زمانہ تھا۔ یہ بجائے خود اس اعتراض کا جواب ہے کہ اگر اسلامی قانون نافذ کر دیا جائے تو ہر طرف لُنجے ہی لُنجے نظر آئیں گے۔ حالانکہ یہ اعتراض بالکل قابل اعتبار نہیں۔ کیونکہ اس طرح تو پھر ہر اچھی چیز کو چھوڑنا پڑے گا، موٹروں کو ایکسیڈنٹ کے خطرے اور سوسائٹی میں اپاہج پیدا کرنے کے الزام میں چھوڑنا پڑے گا۔ ہوائی جہاز، فیکٹریاں اور تعمیر و ترقی کے سارے پلان بند کرنے پڑیں گے کیونکہ عام فائدہ کی ہر چیز میں کسی نہ کسی فرد کے لیے کوئی نقصان نکل ہی سکتا ہے۔ اس سلسلے کی آخری بات رہ گئی، وہ یہ کہ عصر حاضر کے "ترقی پسند"، "آزاد" اور "مہذب ذہن" اور

[۱۵] "تخلیق انسانی کا مقصد دین و شریعت کا قیام"

"زندہ ضمیر" سے جو حدود کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے ہم اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کرے کہ قاتل کو قتل کیا جائے، چور کا ہاتھ کاٹا جائے، اور اسلامی قصاص و حدود کو قبول کرے جس طرح عالمی ضمیر نے ویٹ نام میں ہلاکت کا سامان بہم پہنچایا ہے، اور سرخ انقلاب میں پانچ ملین انسانوں کو آزادی اور مساوات کے نام پر خاک و خون میں تڑپایا، اسلامی خلافت کے سارے مشرقی و مغربی علاقوں پر ظلم و ستم کی دردناک کہانیاں پیش کیں، پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کی اجازت دی، چور کی سزا قتل تک تجویز کی، سامراجی زمانہ میں پھانسی کے تختے لگائے، انسان کی چربی سے صابون بنائے گئے، انسانی کھال جوتوں میں استعمال کی گئی، آتشیں بموں نے شہروں کو ویران اور جسموں کو خاکستر بنایا، اور پستول کی گولیاں چوروں، ڈاکوؤں اور بعض اوقات قانون اور امن کے محافظوں کے ذریعے ہر پُرامن شہری کے سینے کو داغدار کرنے کا ارمان رکھتی ہیں، اور آبرو باختگی اور جنسی انارکی کے مریض ہر عفت مآب گھرانے کا سکونِ دل لوٹنے کے لیے بیقرار نظر آتے ہیں۔ ایسے "پاکباز"، طاہر و لطیف" اور "بیدار" مغربی و مشرقی، مسیحی یا ملحد عالمی ضمیر پر ذرا سی کوشش بھی اگر کی جائے تو شاید مجرم کو شرعی طور پر سزا دینے پر وہ راضی ہو ہی جائے، اور اسلام کی منظم اور محتاط طریقوں پر نافذ کی جانے والی حدود اسے اپنے غیر قانونی کردار اور جنگل کے دستور کے مقابلے میں زیادہ منصفانہ، ہلکی اور موثر نظر آئیں۔

تصحیح اغلاط

تفہیم القرآن میں حسب ذیل مقامات کی اصلاح کر لی جائے

جلد	صفحہ		سطر	غلط	صحیح
جلد سوم	۷۷		۳	جُوِرَكَ	حَوِّلَ
	۹۸		۱	وَلَا يَنۡسٰى	وَلَا يَنۡسَى
	۱۰۸		۴	وَمَا هٰذِى	وَمَا هٰذِى ⑨
	۳۶۸		۱۱-۱۲	جنگ بدر جیسے خطرناک معرکے	بڑے بڑے خطرناک معرکوں
جلد ششم	۱۵۵		۱۶	الدخان ۸۶	الزخرف ۸۶
	۴۸۱		۴	لِلۡمُصَلِّيۡنَ	لِّلۡمُصَلِّيۡنَ
	۵۸۴		۱۱	ثابت شدیدہ	ثابت شدہ

اسلام میں سزائے ارتداد

قسط دوم ——— از عبدالحمید صدیقی

جناب ایس اے رحمان صاحب نے صحیح بخاری کی ایک حدیث نقل کی ہے جو قتلِ مرتد کے معاملہ میں قطعی اور حتمی حکم کی حیثیت رکھتی ہے یعنی ——— مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ ——— اس حدیث کو صاحبِ موصوف نے درج تو کر دیا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ سارا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ کسی طرح اس حدیث کو لفظی اور معنوی اعتبار سے ناقابلِ حجت بنایا جا سکے۔

مگر اسے فاضل مؤلف کی بے بسی سمجھئے کہ اسی مفہوم کی ایک اور روایت جسے امام مالک نے الموطا میں نقل کیا ہے اُن کے سامنے آگئی ——— مَنْ غَيَّرَ دِيْنَهُ فَاضْرِبُوْا عُنُقَهُ ——— اور ان کے استدلال پر پانی پھیر گئی۔ آخر جب کوئی چارۂ کار نہ رہا تو فاضل مصنف نے کچھ اس طرح کی باتیں کرنا شروع کر دیں "ممکن ہے راوی نے حدیث کا مفہوم بیان کیا ہو اور اسے صحیح الفاظ یاد نہ رہے ہوں"۔ اِن کے نزدیک صحیح الفاظ فاضربوا عنقہ نہ تھے جن کا واضح اور غیر مبہم معنیٰ ——— پس اس کی گردن مار دو ——— ہے بلکہ فَاقْتُلُوْا ہے جو استعارۃً خیالات و نظریات کو قتل کرنے کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے یا جناب رحمٰن صاحب کی نظر میں اس سے یہ معنیٰ بھی مراد لیے جا سکتے ہیں کہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرو جیسے وہ مردہ ہو اور اس کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دو۔

فاضل مصنف اس ملک کے ایک معروف اور کہنہ مشق ادیب ہونے کے علاوہ عرصۂ دراز تک عدالت کے اونچے منصب پر بھی فائز رہے ہیں اس لیے ان سے یہ حقیقت کبھی مخفی نہیں ہو سکتی کہ حدود و تعزیرات کے احکام کی استعاروں کی مدد سے تاویل و تعبیر کیا نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ حدیث کے الفاظ صاف طور پر ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ ایک حکمِ شرعی ہے اور اس میں استعارے کی مدد سے تاویل کی کوئی گنجائش نہیں۔

صحیح البخاری اور الموطا کی مذکورہ دونوں احادیث کے بعد شیخ صاحب نے مختلف کتبِ احادیث میں مندرج اس سلسلہ کی تمام احادیث کو یکے بعد دیگرے لیا ہے اور ایک ایک حدیث کے نقائص و عیوب بیان کیے ہیں۔ کسی حدیث کے راوی کا ضعف و کذب بیان کیا ہے۔ کہیں متنِ حدیث کے الفاظ میں (نہ کہ معنیٰ میں) معمولی اختلاف

کو بنیاد بنا کر صحتِ حدیث میں شک کیا ہے۔ اور کہیں یہ کہہ دیا ہے کہ صحابی کو پوری بات سمجھنے میں ناکامی ہوئی ہے۔
اور آخر میں ارتداد کی سزائے قتل میں بعض مستثنیات مثلاً پاگل، مریض حالتِ نشہ میں اعلانِ ارتداد کرنے
والا، مخنث اور عورت کے بارے میں فقہاء کے جزئی و فرعی اختلاف کا سہارا لے کر نیز بعض احادیث میں وارد
ان الفاظ (اَوْ رَجُلٌ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَارْتَدَّ عَنِ الْاِسْلَامِ اور تیسرے اس آدمی کو رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم نے قتل کیا جس نے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی اور اسلام سے مرتد ہو گیا) کے پیشِ نظر رحمان
صاحب نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اصل میں قتل کرنے کا حکم صرف ان مرتدین سے مخصوص ہے جنہوں نے عملاً
خدا اور رسول سے محاربہ کیا ہے۔ وہ لوگ جو ارتداد کے مرتکب ہو کر خاموشی سے بیٹھ گئے انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔
یا اگر بالفرض سب کے لیے ہی قتل کرنے کا حکم ہے تو جس طرح فقہاء نے مذکورہ لوگوں کو قتل سے مستثنیٰ کیا ہے اسی
طرح (رحمان صاحب کا مشورہ ہے) کہ مرتکبِ ارتداد ہو کر خاموشی سے بیٹھ رہنے والے لوگوں کو بھی مستثنیٰ کر دیا
جائے۔ اس ضمن میں ہماری معروضات حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس معاملہ میں صریح ہیں کہ محض دین کی تبدیلی ہی موجبِ قتل ہے
صحیح بخاری کی روایت مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ جو اپنے دین کو تبدیل کرے اسے قتل کر دو۔ نیز مَنْ غَيَّرَ
دِيْنَهٗ فَاضْرِبُوْا عُنُقَهٗ جو اپنے دین کو بدل لے اس کی گردن مار دو۔ ان نصوص صریحہ کے بعد یہ کہنے کی
کوئی گنجائش نہیں کہ دین تبدیل کرنے کے بعد عملاً برسرِ پیکار ہو جانے والے کی گردن مارو۔ حضرت معاذ کے حکم
سے یمن میں جس یہودی کو قتل کیا گیا تھا اور جس فیصلۂ قتل کو حضرت معاذ نے قضاء اللہ و رسولہ سے تعبیر
فرمایا اس کے بارے میں صحیح بخاری کی حدیث صرف یہ بیان کرتی ہے قَالَ كَانَ يَهُوْدِيًّا فَاَسْلَمَ ثُمَّ تَهَوَّدَ۔
(حضرت ابو موسیٰ اشعری نے فرمایا یہ شخص یہودی تھا پھر اسلام لایا بعد ازاں پھر یہودی بن گیا) اگر اس نے
عملاً کوئی فعلِ بغاوت کیا ہوتا تو حضرت ابو موسیٰ اس کا بھی ذکر کرتے۔ امام بخاری کی اس حدیث کو رحمان صاحب یہ
کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ IT IS JUST PROBABLE THAT THE JEW HAD
JOINED THE REBEL GROUP OF ASWAD ANSI IN YEMEN[سلہ]
سوال یہ ہے کہ جامع الصحیح کی اس حدیث کے مقابلہ میں رحمان صاحب کے اس ممکن ہے (JUST PROBABLE)
کی کیا حیثیت ہے۔ شاہ ولی اللہ کے بیان کردہ طبقاتِ کتبِ حدیث میں سے جسٹس صاحب کے اس فرمان کو ہم
کس درجہ میں رکھ سکتے ہیں؟ بخاری کی حدیث کو مسترد کرنے کے لیے کوئی چیز بخاری کے ہم پلہ لائیے اسے

سلہ ص ۱۷

IT MAY BE اور JUST PROBABLE کے ساتھ رد نہیں کیا جا سکتا۔

۴- جناب رحمٰن نے بخاری ہی کی ایک اور حدیث (صفحہ ۱۰۱۶) ۔ اَوْ رَجُلٌ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَ ارْتَدَّ عَنِ الْاِسْلَامِ) اور بعض دوسرے مقامات جہاں حربی یا حارب کا لفظ ان کی نظر پڑا ہے ۔ سے استدلال کرتے ہوئے خلط مبحث کرنے کی کوشش کی ہے کہ سزائے قتل محاربہ و فساد فی الارض کے لیے ہے ارتداد عن الاسلام کے لیے نہیں۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ محاربہ و فساد فی الارض بھی موجباتِ قتل میں سے ہے اور اسلام سے ارتداد و انحراف بھی ایک شخص کے قتل کو واجب کر دیتا ہے ان دونوں کو اکٹھا کرنے کے لیے کوئی مضبوط بنیاد ہونی چاہیئے۔ بیسویں صدی کے چند اشخاص کی خواہش وہ بنیاد نہیں بن سکتی۔ حضرت علیؓ کے زنادقہ کے قتل کا جو واقعہ انہوں نے بیان کیا ہے ثابت کریں کہ ان سے کوئی فعلِ بغاوت سرزد ہوا تھا یا انہوں نے سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یا ان کے کسی گورنر سے محاربہ و قتال کیا تھا۔ اسی طرح سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے مکان کی چھت پر سے مجمع عام کو مخاطب کر کے جو فرمایا:

لا یحل دم امری مسلم الا	کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں سوائے تین
باحدی ثلث: رجل زنی بعد	صورتوں کے ایک وہ آدمی جس نے شادی شدہ
احصانہ فعلیہ الرجم او قتل	ہونے کے بعد زنا کیا ہو اس کی سزا سنگساری
عمدا فعلیہ القود او ارتد بعد	ہے۔ دوسرا وہ کہ جس نے عمداً قتل کیا ہو اس
اسلامہ فعلیہ القتل۔	پر قصاص ہے اور تیسرا وہ کہ جو اسلام لانے کے
	بعد مرتد ہو گیا ہو اس کی سزا قتل ہے۔

اگر محض ارتداد کوئی جرم نہ ہوتا تو حضرت عثمانؓ کو یہ بات زوردار طریقہ سے سرِعام کہنی چاہیئے تھی کہ میں تو ابھی مرتد بھی نہیں ہوا جبکہ اسلام میں مرتد ہونے کے بعد اسلامی حکومت سے محاربہ و قتال کرنے والا گردن زدنی ہوتا ہے۔ لہٰذا تم مجھ گھر بیٹھے کی جان کے درپے کیوں ہو؟

رحمان صاحب کے ذہن میں ارتداد کے ساتھ محاربہ و بغاوت کا پیوند لگانے کا خیال کچھ اس طرح راسخ ہے کہ موصوف حقائق کو مسخ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۳ پر لکھتے ہیں "یہ امر واضح ہے کہ مرغینانی (صاحبِ ہدایہ) کا تجزیہ سب سے بڑی سزا (قتل) کی موثر وجہ عملاً مخالفت و محاربہ یا بغاوت کو قرار دیتا ہے۔"

اور یہ عملاً مخالفت و محاربہ یا بغاوت (ACTIVE HOSTILITY OR REBELLION

حاشیہ ہدایہ کی جس عبارت سے نکالا گیا ہے وہ یہ ہے: ولانہ کافر حربی بلغتہ الدعوۃ اور مرتد کو اس لیے بھی بغیر مہلت دیئے قتل کر دیا جائے گا کہ وہ حربی کافر ہے جسے دعوتِ اسلام پہنچ چکی ہے۔ اور حاشیہ میں کافر حربی کی وضاحت بدیں الفاظ کی گئی ہے:

ان المرتد کافر لامحالۃ ولیس	مرتد لامحالہ کافر ہے نہ اسے مستامن سمجھا جائیگا
بمستامن لانہ لم یطلب الامان	کہ اس نے کوئی امان طلب نہیں کی اور نہ ذمی
ولاذمی لانہ لاتقبل الجزیۃ منہ	ہی قرار دیا جائے گا کہ اس سے جزیہ بھی
فکان حربیاً۔ (عنایہ)	نہیں قبول کیا جاتا لہٰذا وہ حربی ٹھہرا۔

اب آپ دیکھ لیں کہ یہاں مرتد کون سی (ACTIVE HOSTILITY OR REBELLION) کا مرتکب ہو رہا ہے کہ جس کی پاداش میں صاحبِ ہدایہ اسے فی الفور قتل کا مستحق قرار دے رہے ہیں۔ یہاں جس معنیٰ میں مرتد کو حربی کہا گیا ہے وہ تو دراصل جمہور مسلمانوں کے موقف کی ترجمانی ہے جسے ہم آئندہ سطور میں وضاحت سے پیش کر رہے ہیں۔

۳۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نظامِ حکومت کو قائم فرمایا تھا اور خلفائے راشدین نے جسے تیس سال تک کامیابی کے ساتھ چلایا اس کی بنیاد مذہبِ اسلام پر تھی۔ سوال یہ ہے کہ ایسی اسلامی حکومت میں اگر کوئی شخص پہلے اسلام قبول کرے اور بعدازاں مرتد ہو جائے تو کیا اس کا یہ اقدام مذہب کی بنیاد پر قائم ہونے والی ریاست کے خلاف بغاوت نہ سمجھا جائے گا؟ اسلام عام تصورِ مذاہب کے مطابق محض ایک مذہب نہیں بلکہ وہ ایک مذہبِ ریاست ہے ایک نظامِ حکومت ہے اور ایک سیاسی و اجتماعی ہیئت کا نام ہے۔ اسلام اپنی سیاسی و اجتماعی ہیئت کے ساتھ جب جلوہ گر ہوگا تو اس وقت ہی مرتد کو قتل کیا جائیگا آج کے دورِ زوال و انحطاط میں یہ اقدام نہیں ہوگا اور نہیں ہو سکتا فاضل مصنف اور اُن کے ہم خیال لوگوں کو ان حالات میں مطمئن رہنا چاہیئے۔ آج اگر کوئی امریکی اٹھ کر کہے کہ میں امریکہ کے آئین و قانون کو نہیں مانتا یا کوئی فرانسیسی، برطانوی یا روسی اور چینی قومیت رکھنے والا خود اپنے دستور کے خلاف آواز اٹھائے اور اس سے انحراف و ارتداد اختیار کرنا چاہے تو بیسویں صدی کی یہ جدید روشن خیال حکومتیں اس شخص کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہ کریں گی۔

اگر موجودہ حکومتیں ایسے اشخاص کو ہلاک کرنے میں حق بجانب ہوں تو اسلامی نظامِ حکومت میں کسی شخص کے

ارتداد کو کیوں گوارا کیا جائے اور اس کے قتل کے لیے ACTIVE HOSTILITY OR REBELLION کا وجود کیوں ضروری ہو؟ آج اسلامی نظام نافذ نہیں شاید اسی لیے رحمان صاحب کھلم کھلا ارتداد کو ایک ناقابلِ مواخذہ جرم ثابت کر رہے ہیں ورنہ ایک قانونی ماہر ہونے کی حیثیت سے وہ ہم سے بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ کسی حکومت کے باغیوں کی حمایت اور وکالت کرنے والا شخص اس حکومت کی نظر میں کتنا بڑا مجرم ہوتا ہے؟

۴- آخر میں ہم ایک اصولی بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ رحمان صاحب نے مختلف کتبِ حدیث کی متعدد مرویات کو نقل کر کے ان میں سے بعض کی فنّی کمزوریاں بیان کی ہیں، بعض کی نہایت گھٹیا تاویل کی ہے اور بعض کے معانی و مطالب میں تحریف تک کے مرتکب ہوئے ہیں۔ لیکن روایات کی کثرت سے ایک بات جو ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مرتد کی سزائے قتل کا موقف بہرحال ایک مضبوط موقف ہے کیونکہ اصولاً محض دوسرے اور تیسرے درجے کی کتبِ حدیث کی مرویات کی کثرت ہی مرتد کی سزائے قتل کا موقف مضبوط بنانے کے لیے کافی نہیں۔ لیکن اب تو بخاری و مسلم اور الموطا کی متواتر و مقبول احادیث بھی اسی موقف کی ترجمان ہیں۔ لہٰذا کسی حدیث کی فنی کمزوری کوئی پریشانی کی بات نہیں اس لیے کہ ایسی احادیث بخاری و مسلم کی مرویات کی تائید ہی کرتی ہیں۔

(APOSTASY AND THE SUNNAH) کے ساتویں جز میں رحمان صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پیش آنے والے بعض واقعات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ارتداد کی سزا قتل نہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ سے اسی مفہوم کی ایک روایت ملتی ہے کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایک بدو نے قبولِ اسلام کیا اور اطاعت و وفاداری کا حلف اٹھایا لیکن جلد ہی سخت بخار میں مبتلا ہو گیا۔ واپس آیا اور بیعت کی منسوخی کا مطالبہ کیا اس نے تین بار یہ مطالبہ کیا لیکن ہر بار انکار کر دیا گیا۔ بالآخر وہ چلا گیا اس شخص کو رسولِ پاک نے قتل نہیں کیا بلکہ صرف اتنا فرمایا کہ مدینہ کی مثال ایک بھٹی کی ہے جو کھوٹ کو اصل سے الگ کر دیتی ہے۔ اس کے بارے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ یہ واقعہ اسلامی حکومت کے باقاعدہ قیام سے پہلے کا ہے۔ اور حدود کا نفاذ اسلامی حکومت ہی کر سکتی ہے۔

معاہدۂ حدیبیہ کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر مدینہ کا کوئی باشندہ اسلام سے منحرف ہو جائے اور وہ مکہ

میں جاکر پناہ لے لے تو قریش اس کو واپس نہیں کریں گے۔معاہدہ کی اس شق کے بارے میں رحمان صاحب یہ کہتے ہیں کہ اگر ارتداد کی سزا قتل ہوتی تو حضور اس شق کو جو شریعت کے خلاف تھی کبھی قبول نہ فرماتے۔اس کے بارے میں بھی ہمارا جواب وہی ہے جو پہلے دیا جاچکا ہے۔معاہدہ حدیبیہ ذیقعدہ ۶ھ میں ہوا۔اس وقت مکمل سیاسی اختیارات حضور کے ہاتھ میں نہیں تھے۔

قیصر روم نے ابوسفیان کو اپنے دربار میں بلاکر ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ پیغمبر خدا کے پیروؤں میں سے کوئی اسلام قبول کرکے منحرف بھی ہوا ہے یا نہیں تو ابوسفیان نے اس کا جواب نفی میں دیا تھا۔فاضل مصنف نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر ارتداد کی سزا قتل ہوتی تو ابوسفیان کو اس موقع پر یہ ضرور کہنا چاہیے تھا کہ اسلام قبول کرکے کوئی مرتد کیسے ہوسکتا ہے؟ ایسا کرنے والے کا تو سر قلم کردیا جاتا ہے۔لیکن چونکہ ابوسفیان نے یہ نہیں کہا اس لیے ثابت ہوگیا کہ ارتداد کی سزا قتل نہیں۔یہ واقعہ جیساکہ تاریخ سے ثابت ہے صلح حدیبیہ سے متصلاً بعد کا ہے اس وقت سزائے ارتداد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا نہ حالات اس کے لیے سازگار تھے۔

تحویلِ قبلہ کے حکم پر بعض مسلمانوں کے اسلام سے انحراف اور کسی بازپرس کے نہ ہونے سے بھی رحمان صاحب نے یہی استدلال کرنے کی کوشش کی ہے۔اسی طرح واقعہ معراج کے ناقابلِ فہم ہونے کی بناء پر بھی بعض لوگ اسلام سے پھر گئے۔اور ان کو بھی قتل نہیں کیا گیا یہ صورت بھی رحمان صاحب کے لیے اس امر کا ثبوت فراہم کررہی ہے کہ ارتداد کی سزا قتل نہیں حالانکہ ان تمام واقعات کو نقل کرکے ان سے من مانے نتائج اخذ کرنے سے پہلے رحمان صاحب کو تاریخی حالات کا لحاظ کرنا چاہیئے تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنیادی طور پر لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے آئے تھے نہ کہ اسلام سے انحراف کرنے والوں کے لیے پہلے دن سے ہی آپ کو سزا دینے والا مقرر کیا گیا تھا۔سزائے ارتداد کو چند منٹ کے لیے ایک طرف رہنے دیں سوال یہ ہے کیا باقی جرائم کی سزائیں آپ نے مبعوث ہوتے ہی دینا شروع کردی تھیں۔شراب، قمار، چوری اور زنا جیسے جرائم شروع سے ہی روحِ اسلام کے منافی سمجھے جاتے تھے لیکن ان کی تعزیر و حدود کا نفاذ مناسب حالات میں اپنے اپنے وقت پر ہوتا رہا۔آخر ایک ارتداد ہی کے بارے میں سوچنے کا یہ انداز کیونکر درست ہوسکتا ہے کہ جب اور جن حالات میں بھی کسی شخص سے فعل ارتداد کا صدور ہوا جھٹ سے اس کی گردن قلم کی جانی چاہیئے تھی۔

بعض منافقین کی ارتداد پر مبنی سرگرمیوں کے باوجود ان پر کوئی گرفت نہ ہونے سے بھی رحمان صاحب سزائے ارتداد کی نفی کرتے ہیں۔حالانکہ ارتداد اعلان و اظہار کی صورت میں سامنے آتا ہے جبکہ نفاق دل کی

ایک پوشیدہ بیماری کا نام ہے اور شریعت کا فیصلہ ظاہر پہ نافذ ہوتا ہے باطن پہ نہیں چونکہ منافقین بظاہر تمام ارکانِ اسلام کی پابندی کرتے تھے۔ اور کسی غلطی کے ارتکاب پہ جھوٹی قسم بھی کھا لیتے تھے اس لیے شریعت کی تعزیرات و حدود کی زد میں آنے سے بچ جاتے تھے رہا ان کے نفاق و ارتداد کا خدا کے علم میں ہونا تو محض اپنے علم کی بنیاد پہ اللہ تعالیٰ دنیا میں کسی پہ گرفت نہیں کرتے تیز حضورؐ کے زمانہ کے منافقین کی گرفت اگر وحی کی بنیاد پہ ہو جاتی تو بعد کے منافقین کا کیسے پتہ چلایا جاتا۔ سزا دینا تو بعد کی بات ہے۔

(APOSTASY AND THE SUNNAH) کی بحث کے اختتام پہ ایک بار پھر رحمٰن صاحب نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ چونکہ رسولؐ پاک کے ارشادات در باب سزائے ارتداد کا مخصوص پس منظر معرضِ خفا میں ہے لہٰذا ان ارشادات کو قرآن کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے خلاف کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ حالانکہ ارتداد یا کفر بعد اسلام کا ذکر جہاں قرآن میں آیا ہے وہاں اس اقدام کی سنگینی و شدت کا ذکر موجود ہے۔ ایک مقام پہ فرمایا فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (ان لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے)۔ ایک دوسری جگہ فرمایا لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ (ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی اور یہی لوگ گمراہ ہیں) سورۃ توبہ میں فرمایا وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (اور اگر یہ منہ پھیر لیں گے تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں انہیں عذاب الیم دے گا)۔ قرآن کی ان آیات کو دیکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ رسولِ پاک نے ارتداد کی سزا قتل جو مقرر فرمائی ہے وہ قرآن کے خلاف ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ قرآن میں صرف اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کا حکم آیا ہے لہٰذا رسولِ پاک نے اقامتِ صلوٰۃ کی جو تفصیلات بیان فرمائی ہیں وہ قرآن کے خلاف ہیں یا نصابِ زکوٰۃ کی تعیین کر کے آپؐ نے معاذ اللہ حکمِ قرآن وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ کی خلاف ورزی کی ہے۔ قرآن کی اسی تبیین و تشریح کی بناء پہ محقق علمائے اُمت نے السنة قاضية على الكتٰب کا موقف اختیار کیا ہے۔ جس کی تشریح شیخ خضری کے الفاظ میں یہ ہے:

ليس معنى قضاء السنة على	قضاء السنۃ علی الکتاب کا یہ معنی نہیں کہ کتاب
الكتاب انها مقدم في الاعتبار	اللہ کو نظر انداز کر کے سنت کو اس پر مقدم
عليه ويطرح الكتاب بل معنى ذلك	کر لیا جائے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ سنت
انها تبين المراد به فبيان السنة	کتاب اللہ کی مراد اور مفہوم کی وضاحت کرتی

هو مراد الكتاب فكان السنة بمنزلة التفسير والشرح للكتاب دل على ذلك قوله تعالى (لتبين للناس ما نزل اليهم) فاذا حصل بيان قوله تعالى (والسارق والسارقة فاقطعوا ايديهما) بان القطع من الكوع وان المسروق نصاب فاكثر من حرز مثله فذلك هو المعنى المراد من الاية لان السنة اثبتت هذه الاحكام دون الكتاب كما اذا بين لنا احد المفسرين معنى اية او حديث فعملنا بمقتضاه فلا يصح ان نقول انا عملنا بقول المفسر فلا دون ان نقول عملنا بقول الله او رسوله وهكذا سائر ما بينته السنة

(اصول الفقه ص۲۶۸)

ہے اور سنت کی وضاحت کتاب اللہ کی حقیقی مراد ہوتی ہے ۔ اس طرح سنت کتاب اللہ کے لیے بمنزلہ تفسیر و شرح کے ہے ہمارے اس اصول کی تائید خود قرآن سے ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (اسے نبی تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ لوگوں کے لیے نازل کردہ تعلیمات کی تبیین و تشریح کرو) پس جب قرآن پاک کا یہ حکم نازل ہوا کہ (چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھوں کو کاٹ دو) تو سنت سے معلوم ہوا کہ ہاتھوں کو گھٹنے سے کاٹا جائے نیز مال مسروقہ کی مقدار یا اس سے زائد ہو کسی محفوظ مقام سے چرایا جائے یہ تفصیل بھی سنت نے ہی بتائی۔ اور یہی معنی مراد ہے اس آیت کا۔ السنۃ قاضیۃ علی الکتاب کا یہ معنی نہیں کہ سنت ان احکام کا اثبات کتاب اللہ سے ہٹ کر کرتی ہے ۔ جس طرح کوئی مفسر کسی آیت یا حدیث کے معنی کی وضاحت کرے اور ہم اس کے مقتضاء پر عمل پیرا ہو جائیں تو یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ہم فلاں مفسر کے قول پر عمل کرتے ہیں بلکہ اس کے برعکس ہمارے لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہم اللہ اور اس کے رسول کے قول پر عمل پیرا ہیں ۔ اور یہی معاملہ سنت کے تمام بیان کردہ امور کا ہے ۔

خلفائے راشدین کا عمل جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے جناب ایس اے رحمان صاحب اپنا پورا زور استدلال اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ محض ارتداد کی اسلام میں کوئی سزا نہیں اور اگر قرون اولیٰ میں کسی کو سزائے قتل دی گئی ہے تو وہ دراصل محاربہ و بغاوت کی سزا تھی، ارتداد کی سزا نہیں تھی۔ چنانچہ اپنے اس موقف کو مبنی برحق ثابت کرنے کے لیے موصوف کو تاریخی واقعات میں اگر کہیں حرب و بغی یا اس کے لیے تحریض کا شائبہ تک کہیں نظر آیا تو انہوں نے اس واقعہ کو اپنے موقف کی تائید میں درج کر دیا قطع نظر اس سے کہ وہ کس پس منظر اور کس تناظر میں وہاں درج کیا گیا تھا۔

کتاب کے تیسرے باب "ارتداد اور خلافت راشدہ" کا آغاز آنجناب نے اس بات سے کیا ہے کہ بیان کیا جاتا ہے کہ اُم قرفہ (ایک عورت کی کنیت (فاضل مصنف اسے ام فرقہ پڑھتے رہے ہیں) کو مرتد ہو جانے کی بناء پر سیدنا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ یہ عورت مرتد ہونے کے علاوہ اپنے تیس بیٹوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑنے کی تاکید و تحریض کا باغیانہ اقدام کرتی تھی اور اسی وجہ سے حضرت ابو بکر نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا تھا پس حضرت ابو بکر کے اس اقدام کو سزائے ارتداد پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے نیچے امام سرخسی کی کتاب المبسوط ج ۱۰ ص ۱۱۰ کا حوالہ درج ہے۔

لیکن آپ المبسوط کا متعلقہ باب نکال کر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہاں جس سباق و سیاق میں یہ بات لکھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ شوافع مرتد عورت کو قتل کر دینے کے قائل ہیں۔ امام سرخسی نے ان کے اس مسلک کے دلائل بیان کرنے کے بعد احناف کا مسلک بھی بیان کیا ہے جس کی رو سے مرتد ہو جانے والی عورت کو قتل کرنے کے بجائے قید کیا جائے گا تا آنکہ یا تو وہ توبہ کرے یا قید ہی میں پڑی پڑی مر جائے۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔ بہرحال امام سرخسی نے فقہ حنفی کا دفاع کرتے ہوئے شوافع کے مسلک کی تائید میں جانے والے اس اثر کو کہ حضرت ابو بکرؓ نے ام قرفہ کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا کے مختلف احتمالات کی یہ توجیہ بھی پیش کی ہے کہ وہ اپنے تیس بیٹوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑنے کی تحریض و ترغیب دیتی تھی۔ امام موصوف کی المبسوط میں یہ ساری بحث دیکھنے کے بعد جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے ائمہ نفسِ ارتداد کی سزائے قتل پر تو پوری طرح متفق ہیں البتہ اس مسئلہ میں بعض فروعی اختلافات پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک اوپر بیان ہوا ہے۔ تاہم اس اختلاف کا بھی کوئی فائدہ جناب ایس اے رحمٰن صاحب کو نہیں پہنچتا اس لیے کہ مرتد ہو جانے والی عورت کو فقہاء اپنے فروعی اختلافات کے باوجود کھلی چھٹی دے دینے کے قائل نہیں ہیں جو رحمٰن صاحب

کا موقف ہے۔ وہ اسے قید میں ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔

یہاں ضمناً ایک بات ہم اور کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ فاضل مؤلف نے اپنی کتاب میں مسلمانوں کی متعدد گراں قدر اور عظیم الشان کتب کے حوالے درج کیے ہیں جن سے ان کی کتاب کا کم پڑھا لکھا قاری یہ تاثر قائم کر سکتا ہے کہ رحمان صاحب کے موقف کا بھی کچھ نہ کچھ وزن تو ضرور ہے اور ہمارے اسلاف کی کتب میں بھی ایسا مواد موجود ہے جو ان کے موقف کی تائید کرتا ہے لیکن آپ اسی المبسوط ہی کے باب المرتدین کا مطالعہ کر کے دیکھ لیں جو بڑے سائز کے پچیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے آپ کو رحمن صاحب کے موقف کی قدم قدم پر تردید ہوتی نظر آئے گی۔ یہی حال امام طحاوی کی شرح معانی الآثار، امام طبری کی تاریخ اور امام فخر الدین رازی کی تفسیر کے اقتباسات و حوالہ جات کا ہے ہم نے ان چند کتب کا نام اس لیے لیا ہے کہ اسی باب میں خاص طور پر ان کا ذکر آرہا ہے اور یہ سارے حضرات قتل مرتد کے قائل ہیں۔ یہ عجیب طرح کی ریسرچ ہے کہ ہمارے ائمہ و اسلاف اور ان کی تمام کتابیں جس موقف کی سراسر تردید کرتی ہیں اس کی تائید میں انہی بزرگوں کا نام اور کام بے دریغ استعمال کیا جا رہا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عہد صدیقی میں طوفانِ ارتداد اٹھ کھڑا ہوا جس کی زد میں عرب کے بیشتر مسلم قبائل بہہ گئے تھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے یہ ہمت اور توفیق دی کہ انہوں نے ان مرتدین کے خلاف جہاد و قتال کر کے ان کی مکمل سرکوبی کی۔ رحمن صاحب نے تفسیر کبیر کے حوالہ سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان قبائل نے ارتداد کے ساتھ ساتھ بغاوت کا بھی ارتکاب کیا تھا اور نتیجۃً رسول پاک کے تعینات کردہ عمال کو اپنے علاقوں سے نکال باہر کیا تھا۔ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اُن کے خلاف جو کارروائی کی وہ درحقیقت اس جرم بغاوت کے خلاف تھی نہ کہ ارتداد کے خلاف۔ لیکن اگر آپ تفسیر کبیر کا متعلقہ حصہ نکال کر دیکھیں تو وہاں آپ کو دوسری ہی صورت نظر آئے گی۔ امام رازی نے گیارہ مرتد قبائل کا ذکر کیا ہے جن میں سے تین قبائل بنو مدلج، بنو حنیفہ اور بنو اسد رسولِ پاک کے عہدِ مبارک میں مرتد ہوئے اور آنحضورؐ نے ان کے ارتداد اور باغیانہ اقدامات پر گرفت کی اور اپنے گورنروں کو لکھا کہ ان کی سرکوبی کریں۔ سات قبائل نے حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں دین حق سے ارتداد کیا اور آپ نے ان کے خلاف فوج کشی کی اور ایک قبیلہ کا ارتداد دورِ فاروقی میں ثابت ہے۔ امام رازی نے عہدِ رسالت کے مرتدین کے باغیانہ اقدامات کا تو ذکر کیا ہے

مگر عہدِ صدیقی کے مرتدین کے صرف ارتداد ہی کا ذکر کیا ہے ان کی بغاوت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا مگر رحمان صاحب کی چابکدستی وفن کاری ملاحظہ ہو کہ خلیفۂ اول کے زمانے میں اٹھنے والے طوفانِ ارتداد کی بحث میں بطورِ ثبوت عہدِ رسالت کے مرتدین کے باغیانہ اقدامات بیان کر دیے اور قاری کو تاثر یہ دیا کہ عہدِ صدیقی کے مرتدین نے بھی محض ارتداد ہی نہیں بلکہ اسلامی حکومت کے خلاف بغاوتیں کی تھیں جنہیں فرو کرنے کے لیے جناب صدیق اکبرؓ نے فوج کشی کی۔ (تفسیر کبیر سورۃ المائدہ : ۵۴)

اسی طرح تاریخ الطبری کے حوالہ سے جناب شیخ عبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ وہ درحقیقت باغی قبائل تھے جنھوں نے عہدِ صدیقی میں زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا اور ذمہ دارانِ ریاست کی حکم عدولی کی۔ نیز یہ کہ چونکہ زکوٰۃ کی فراہمی کا بندوبست حکومت کرتی تھی اس لیے حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کا مطلب حکومت کے اختیارات کو چیلنج کرنا تھا جو بغاوت پر ہی محمول کیا جا سکتا ہے .. اور اس بغاوت کو فرو کرنا بہرحال حکومت کا فرض تھا جو ادا کیا گیا۔ اس کارروائی کو صرف ارتداد کے خلاف سمجھنا درست نہیں۔

لیکن اگر آپ تاریخ الطبری کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ابو جعفر محمّد بن جریر الطبری کی نظر میں حضرت ابوبکر کی خلافت کا پہلا سال ——— السنۃ الحادیۃ العشرۃ ——— تھا ہی سالِ ارتداد و انحراف۔ اس بات کا اندازہ ہجرت کے گیارھویں سال کے حوادث و واقعات کی فہرست پر ہی ایک نظر ڈالنے سے ہو جاتا ہے۔ مزید برآں خلیفۂ اول جناب ابوبکر صدیقؓ کی شہادت بھی اسی سلسلہ کی معتبر ترین دستاویز ہے کیونکہ رسولِ پاکؐ کی وفات کے بعد اسلامی حکومت جس اضطراب سے دوچار ہوئی اس کا براہِ راست تعلق جناب صدیق ہی سے تھا اس لیے آپ ہی بہتر طور پر بتا سکتے ہیں کہ وہ اضطراب، ارتداد کا پیدا کردہ تھا یا اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کا نیز یہ کہ ان میں سے کس کا انسداد و استیصال خلیفۂ اول کے نزدیک اہم تر اور اولیت کا مستحق تھا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی یہ شہادت تاریخ طبری ہی میں ہمیں ان کے ایک مکتوب سے ملتی ہے جسے آپ نے مرتد قبائل کے نام لکھا تھا اور جس میں آپ نے اپنے امراء کو کچھ وصیتیں کی تھیں۔ مکتوب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

من ابی بکر خلیفۃ رسول اللہ صلی	ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی
اللہ علیہ وسلم الی من بلغہ کتابی	طرف سے عوام و خواص سے تعلق رکھنے والے

اور حج میں تفریق روا ہے بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کلمۂ طیبہ، نماز، روزہ اور حج کی جگہ تنہا لفظ نماز بولنا کافی سمجھا ہے کہ یہ سب بدنی عبادتیں ہیں جبکہ زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ حضرت صدیقِ اکبر کا مطلب یہ ہے کہ جس خدا کے حکم سے یہ بدنی عبادتیں انسان پر فرض ہوئی ہیں اسی خدا نے مالی عبادت (زکوٰۃ) کو بھی واجب ٹھہرایا ہے لہٰذا اگر زکوٰۃ کا انکار کیا جائے تو باقی عبادات کا آپ سے آپ انکار لازم آتا ہے۔ عرض کرنے کا منشا یہ ہے کہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نزدیک ادائے زکوٰۃ سے انکار اسلام سے انحراف وارتداد کے مترادف تھا اس لیے آپ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف بلا تامل اعلانِ جنگ کر دیا جس پر بالآخر تمام صحابہ کرام نے اتفاق کیا۔

۲۔ اگر ایک لحظہ کے لیے فرض کر لیا جائے کہ زکوٰۃ بھی دوسرے محاصل کی طرح ایک سرکاری محصول ہی تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کی کونسی ایسی حکومت ہے جو محض کسی محصول کے ادا نہ کرنے پر اپنے شہریوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیتی ہو۔ محصول ادا نہ کرنے پر انہیں جرمانہ کیا جاسکتا ہے ان کی جائداد ضبط کی جاسکتی ہے یا پھر انہیں قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا جاسکتا ہے ان کے ساتھ جنگ کرنے کی ضرورت آج تک دنیا کی کسی حکومت نے محسوس نہیں کی۔

مانعین زکوٰۃ کے سلسلہ میں خلیفہ اول نے جو رویہ اختیار کیا اور صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین نے جس سے کامل اتفاق کیا اور بعد ازاں تابعین عظام اور آئمہ دین نے جسے تعلیماتِ دین کے عین مطابق قرار دیا اس سے ہمارے اس موقف ہی کی تائید ہوتی ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے چاہے وہ خدا کی توحید اور رسول کی رسالت کا انکار کر کے مرتد ہوا ہو یا ادائے زکوٰۃ کا انکار کر کے۔ (باقی)

(بقیہ صفحہ ۸)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ۔ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ۔

(ابراہیم: ۶-۷)

یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ اس نے تم کو آل فرعون سے نجات دلائی جو تم کو سخت تکلیفیں دیتے تھے تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ بچا رکھتے تھے اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی اور یاد رکھو تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر تم شکرگزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے

منكم عن دينه بعد ان اقر بالاسلام وعمل به اغترارا بالله وجهالة بامره واجابة للشيطان ـ

کی مجھے خبر پہنچی ہے جس نے بھی اسلام کا اقرار کرنے اور اس کی تعلیمات پہ عمل پیرا ہونے کے بعد اپنے دین سے انحراف کیا اللہ تعالیٰ کے معاملے میں دھوکا کھا کر، اس کے امر سے جاہل رہتے ہوئے اور شیطان کی بات قبول کر کے۔

بعدازاں جنابِ صدیقِ اکبرؓ قرآنِ پاک کی آیات نقل کر کے اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ شیطان روزِ اول سے ہی انسان کا بدترین دشمن چلا آ رہا ہے اور اس کی ہر وقت یہ کوشش رہتی ہے کہ اولادِ آدم کو خدا کے احکام سے برگشتہ کرے اور اس کی نافرمانی پر اکسائے لہٰذا شیطان اور اس کی ذریت کے جھانسے میں نہیں آنا چاہیے۔ آخر میں لکھتے ہیں:۔

وانى بعثت اليكم فلانا فى جيش من المهاجرين والانصار والتابعين باحسان وامرته الا يقاتل احدا ولا يقتله حتى يدعوه الى داعية الله ـ فمن استجاب له واقر وكف وعمل صالحا قبل منه واعانه عليه ومن ابى امرت ان يقاتله على ذلك ثم لا يبقى على احد منهم قدر عليه وان يحرقهم بالنار ويقتلهم كل قتلة وان يسبى النساء والذرارى ولا يقبل من احد الا الاسلام فمن اتبعه فهو خير له ومن تركه فلن

اور میں نے فلاں آدمی کو انصار و مہاجرین اور احسان میں ان کی پیروی کرنے والوں پر مشتمل ایک لشکر دے کر تمہاری طرف بھیجا ہے اور اسے حکم دیا ہے کہ وہ کسی سے نہ لڑائی کرے نہ کسی کو قتل کرے جب تک کہ اسے اللہ (کے دین) کی طرف دعوت نہ دے لے پھر جس نے اسے قبول کر لیا اور اس کا اقرار کیا اور انکار و ارتداد سے باز رہا اور عمل صالح کیا اس کے عہد و پیمان کو قبول کر لے اور اس معاملے میں اس کی مدد کرے اور جس نے دعوت الی اللہ کا انکار کیا میں نے سالارِ لشکر کو حکم دیا ہے کہ وہ اس انکار کی بنا پر اُس سے لڑائی کرے اور ان میں سے جس جس پر قادر ہو ذرہ برابر

یعجز اللہ۔ رحم نہ کرے ان کو آگ میں جلا ڈالے اور ان کا
مکمل استیصال کر دے۔ نیز یہ کہ ان کی عورتوں
اور بچوں کو غلام بنا لے اور ان سے اسلام کے
علاوہ کوئی چیز قبول نہ کرے کیونکہ جو شخص
دینِ اسلام کو ترک کر دے گا وہ اللہ تعالیٰ کو
ہرگز عاجز نہ کر سکے گا۔

(تاریخ طبری الجزء الثالث صفحہ ۲۵۰-۲۵۱ مطبوعہ دار المعارف، مصر)

خلیفۂ راشد کے اس طویل مکتوب کے اقتباسات ہم نے اس لیے دیئے ہیں تاکہ لوگوں کو خود ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبانی معلوم ہو سکے کہ اطراف و اکنافِ عرب میں ان کی لشکر کشی کا باعث کیا چیز تھی فتنۂ ارتداد یا شورش و بغاوت۔ آپ اس پورے مکتوب کو پڑھ جائیں آپ کسی ایک جگہ کی بھی نشاندہی نہیں کر سکتے جس میں ارتداد کے علاوہ کسی اور چیز کا ذکر ہو۔

تاریخ طبری کے بعض دیگر مقامات سے بلاشبہ اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مرتد ہونے والے قبائل کے بعض افراد باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے اسی طرح عمدۃ القاری کے ایک اقتباس سے بھی جسے فاضل مؤلف نے نقل کیا ہے، صورتِ حالات کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے مگر شورش و بغاوت کے ان معدودے چند واقعات سے یہ بہرحال ثابت نہیں ہوتا کہ مرتد ہونے والا ہر قبیلہ اور اس قبیلے کا ہر فرد جرمِ بغاوت ہی کا مرتکب ہوا جس کے لیے ہر مرتد قبیلے کی طرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فوج کشی کرنا پڑی۔

ہمارا موقف یہ ہے کہ ہنگامۂ ارتداد وسیع پیمانے پر بپا ہوا اور اس کے ساتھ ہی کہیں کہیں جرمِ بغاوت کا ارتکاب بھی کیا گیا، مگر خلیفۂ راشد کی نظر میں اہم تر فتنہ فتنۂ ارتداد ہی تھا اور اسی کی سرکوبی کے لیے پوری سرگرمی دکھائی گئی۔ اب اگر کوئی صاحب کہیں کہ محض ارتداد کی سرکوبی کی کوئی کوشش نہیں کی گئی بلکہ بغاوتوں کو فرو کیا گیا تھا تو انہیں ہر قبیلے کے بارے میں ثابت کرنا ہوگا کہ اس کے فلاں فلاں باغیانہ اقدامات کی بنا پر اس کے خلاف جہاد و قتال کیا گیا۔ مورخینِ اسلام جہاں اور معمولی معمولی باتوں کی نشاندہی کرتے ہیں وہاں مرتد قبائل کے باغیانہ اقدامات سے، اگر وہ فی الواقع کیے گئے ہوتے۔ صرفِ نظر نہیں کر سکتے تھے۔

عہد صدیقی کے واقعات پر بحث کرتے ہوئے فاضل مؤلف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر ارتداد کی سزا فی الواقع قتل ہی ہوتی تو عیینہ بن حصن اور قرہ بن ہبیرہ کو مرتد ہونے کے باوجود سزا سے مستثنیٰ کیوں کیا گیا؟ یہ بات صاحبِ موصوف نے تاریخ طبری کے حوالہ سے کہی ہے لیکن تاریخ طبری ہی میں ان کے بارے میں جو صراحت کی گئی ہے نہ معلوم اسے فاضل مصنف نے کیوں نظرانداز کر دیا ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ عیینہ بن حصن ایمان ہی نہیں لائے تھے۔ اور وہ برملا اس کا اظہار کرتے تھے:

واللّٰہ ما کنت آمنتُ باللّٰہ قط۔ فتجاوز عنہ ابو بکر وحقن لہٗ دمہٗ۔	بخدا میں کبھی ایمان ہی نہیں لایا تھا (مرتد ہونے کا سوال کیسے پیدا ہوگیا) چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کی سزا موقوف کر دی اور اسے بچا لیا۔

رہا قرہ بن ہبیرہ کا معاملہ تو وہ خود مسلمان ہی رہے تھے اور ان کے اسلام کے شاہد حضرت عمرو بن العاص تھے البتہ انہیں اخذِ زکوٰۃ کے باب میں بنی عامر کے قلبی احساسات حضرت عمرو بن العاص تک منتقل کرنے کی بناء پر دھر لیا گیا کہ کہیں ان کے بھی یہی خیالات نہ ہوں مگر بعد میں جب حضرت ابوبکرؓ پر حقیقتِ حال واضح ہوئی تو آپ نے انہیں چھوڑ دیا۔

(تاریخ الطبری الجزء الثالث صفحہ ۲۶۰)

مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں ہم رحمٰن صاحب کا موقف پہلے نقل کر چکے ہیں کہ اس وقت زکوٰۃ حکومت وصول کرتی تھی اور حکومت کو زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا مطلب اس کے اختیارات کو چیلنج کرنا اور اس کے خلاف بغاوت کرنا تھا مگر ہمارے نزدیک جسٹس صاحب کا یہ موقف بوجوہ غلط ہے۔

۱۔ زکوٰۃ حکومت کا عائد کردہ کوئی محصول (STATE IMPOST) نہیں جیسا کہ رحمٰن صاحب کا خیال ہے بلکہ نماز کی طرح ایک عبادت اور دینی فریضہ ہے اور اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے۔ پس ادائے زکوٰۃ سے انکار درحقیقت ایک رکنِ دین کا انکار ہے جسے معمولی چیز سمجھ کر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ارکانِ دین کے انکار کا سلسلہ اگر ایک دفعہ شروع ہو جائے تو پھر وہ کہیں رک نہیں سکتا اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نماز اور زکوٰۃ میں تفریق پر اعلان جنگ کر دیا۔ یہاں اس امر کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ نماز اور زکوٰۃ میں عدمِ تفریق کا یہ مطلب نہیں کہ نماز، روزہ یا روزہ

اور حج میں تفریق روا ہے بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کلمۂ طیبہ، نماز، روزہ اور حج کی جگہ تنہا لفظ نماز بولنا کافی سمجھا ہے کہ یہ سب بدنی عبادتیں ہیں جبکہ زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ حضرت صدیق اکبر کا مطلب یہ ہے کہ جس خدا کے حکم سے یہ بدنی عبادتیں انسان پر فرض ہوئی ہیں اسی خدا نے مالی عبادت (زکوٰۃ) کو بھی واجب ٹھہرایا ہے لہٰذا اگر زکوٰۃ کا انکار کیا جائے تو باقی عبادات کا آپ سے آپ انکار لازم آتا ہے۔ عرض کرنے کا منشا یہ ہے کہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نزدیک ادائے زکوٰۃ سے انکار اسلام سے انحراف و ارتداد کے مترادف تھا اس لیے آپ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف بلا تامل اعلانِ جنگ کر دیا جس پر بالآخر تمام صحابہ کرام نے اتفاق کیا۔

۲- اگر ایک لحظہ کے لیے فرض کر لیا جائے کہ زکوٰۃ بھی دوسرے محاصل کی طرح ایک سرکاری محصول ہی تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کی کونسی ایسی حکومت ہے جو محض کسی محصول کے ادا نہ کرنے پر اپنے شہریوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیتی ہو۔ محصول ادا نہ کرنے پر انہیں جرمانہ کیا جاسکتا ہے ان کی جائداد ضبط کی جاسکتی ہے یا پھر انہیں قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا جاسکتا ہے ان کے ساتھ جنگ کرنے کی ضرورت آج تک دنیا کی کسی حکومت نے محسوس نہیں کی۔

مانعین زکوٰۃ کے سلسلہ میں خلیفہ اول نے جو رویہ اختیار کیا اور صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین نے جس سے کامل اتفاق کیا اور بعد ازاں تابعین عظام اور آئمہ دین نے جسے تعلیماتِ دین کے عین مطابق قرار دیا اس سے ہمارے اس موقف ہی کی تائید ہوتی ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے چاہے وہ خدا کی توحید اور رسول کی رسالت کا انکار کر کے مرتد ہوا ہو یا ادائے زکوٰۃ کا انکار کر کے۔ (باقی)

(بقیہ صفحہ ۸)

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنجَاكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ۔ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ۖ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ۔

(ابراہیم: ۶-۷)

یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ اس نے تم کو آل فرعون سے نجات دلائی جو تم کو سخت تکلیفیں دیتے تھے تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ بچا رکھتے تھے اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی اور یاد رکھو تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر تم شکرگزار رہو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے

کسی قوم کا لین دین اور ماپ تول میں کمی بیشی کرنا، دھوکے اور فریب سے بندگانِ خدا کو لوٹنا اور ایسی چالیں چلنا جن سے دوسروں کے مفادات کو نقصان پہنچا کر اپنا الو سیدھا کرنا ممکن ہو ـــــ یہ سب امور بھی غضبِ الٰہی کو دعوت دینے والے ہیں اور ان جرائم کے مرتکب افراد ہوں یا اقوام اللہ کے عذاب کی لپیٹ میں آنے سے انہیں کوئی طاقت بچا نہیں سکتی۔ غور سے سنیئے حضرت شعیبؑ اپنی قوم کو کن امور پر متنبہ فرما رہے ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ - وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ - (ہود: ۸۴-۸۵)

فرمایا اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو جس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ماپ اور تول میں کمی نہ کرو۔ آج میں تمہیں آسودہ حال دیکھتا ہوں مگر تمہارے بارے میں ایک گھیر لینے والے دن کے عذاب سے بہت ڈرتا ہوں۔ اور اے میری قوم ماپ اور تول انصاف کے ساتھ پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور نہ زمین میں فساد مچاتے پھرو۔

اسی طرح کسی قوم میں فسق و فجور اور فواحش کا فروغ بھی اُس کو خدا کے غضب کا مستحق بنا دیتا ہے۔ قوم لوط کو پتھروں کی بارش برسا کر جس بری طرح تہس نہس کر دیا گیا تھا اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس قوم کے افراد سرِ عام برائی اور بے حیائی کے کام کرتے تھے نتیجۃً اللہ کا عذاب اس خوفناک طریقے سے بھڑکا کہ اُس کے بھیانک پن کا اندازہ آج بھی اس علاقے کے کھنڈرات اور آثار و شواہد کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔

ان صفحات میں عذابِ الٰہی کے نزول کے اسباب کی نشاندہی سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اہلِ پاکستان اس باب میں اللہ کی سنت کو اچھی طرح جان لیں اس لیے کہ جن جرائم کی بدولت پہلی قومیں تباہ و برباد کر دی گئی ہیں اگر ان جرائم کا ارتکاب آج کوئی قوم کرتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اللہ کے احتساب اور گرفت سے بچ جائے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ ہمیں اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہیئے اور پھر سوچنا چاہیئے کہ سقوطِ مشرقی پاکستان، افواجِ پاکستان کی اسارت، گرانی و معیشت، خشک اور موجودہ سیلابِ بلاخیز جیسے ہولناک مصائب ہم پر کیوں پے در پے نازل ہو رہے ہیں فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ۔

آخر میں ہم مختصر طور پر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عذابِ الٰہی کے ٹلنے کی صورت کیا ہے؟ اس معاملے میں کتاب اللہ ہماری پوری پوری رہنمائی کرتی ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ کامل جذبۂ عجز و انکساری اور اعترافِ گناہ کے ساتھ اس

رہنمائی کو قبول کریں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔

وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ○ (الزمر: ۵۴)

اور اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرمانبردار بن جاؤ اس سے پیشتر کہ تم پر عذاب آئے۔ پھر کوئی تمہاری مدد کو نہ پہنچے گا۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰکِنْ کَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ۔

(الاعراف: ۹۶)

اور اگر مختلف بستیوں کے باشندے ایمان لے آتے اور پرہیزگار بن جاتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی نعمتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کو ان کے اعمال کی پاداش میں پکڑ لیا۔

وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِیْهِمْ ؕ وَمَا کَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ۔

(الانفال: ۳۳)

اور اللہ ہرگز ان پر عذاب نہ بھیجتا جب تک آپ ان کے درمیان رہتے اور اللہ ہرگز ان پر عذاب نازل نہ کرے گا جب تک وہ معافی مانگتے رہیں۔

ان آیات کے مطالعہ سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ توبہ و انابت اور رجوع الی اللہ عذابِ الٰہی کو دفع کرنے والے اعمال ہیں اسی طرح خدا و رسول اور یوم آخرت پر ایمان لانا کتابِ الٰہی کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا اور پرہیزگاری و خدا ترسی کی زندگی بسر کرنا بھی ذاتِ حق کی رضا اور خوشنودی کا باعث ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ ان اوصاف کی حامل قوموں پر زمین و آسمان کے رزق کے خزانے کھول دیتے ہیں اور خوشحالی و فارغ البالی کا دور دورہ ہو جاتا ہے نیز کسی قوم میں اللہ کے پیغمبر کا وجود بھی باعثِ رحمت ہوتا ہے اور اس وجودِ مقدس کی برکتوں سے وہ اللہ کے عذاب سے مامون و مصئون رہتی ہے اسی طرح اولیاء و صلحاء اور اہل اللہ کا وجود بھی قوموں سے عذابِ الٰہی کو ٹالتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہنا بھی وہ موثر عمل ہے جسے اگر خلوصِ دل سے کیا جائے تو اللہ کی رحمت کو یقیناً جوش آجاتا ہے اور افراد و اقوام کی فردِ عمل چاہے وہ کتنی ہی سیاہ کیوں نہ ہو یکسر دھل جاتی ہے۔

پس ہمیں چاہیئے کہ اپنے اوپر نازل ہونے والے ان پے در پے حوادث سے بچاؤ کے لیے اللہ کی طرف رجوع کریں اس کے دین کی تعلیمات کا دامن مضبوطی سے تھام لیں اور منکرات و فواحش سے کامل اجتناب کریں۔ اُس کی بارگاہ میں سرِ نیاز جھکا کر ہر وقت توبہ و استغفار کرتے رہیں کہ صرف وہی ذات ہے جو ہمارے درد و غم کا مداوا کر سکتی ہے اور مشکل مسائلِ حیات کو حل کر کے ہمیں امن و سکون سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ وما علینا الا البلاغ